بیسویں صدی
نئی دہلی
مئی ۱۹۹۵ء
12/-

آفت کی سفیدی ہے قیامت کی سیاہی
نیرنگِ دو عالم مجھے دکھلا گئیں آنکھیں
(امیر مینائی)

ایڈیٹر: ضیاء الرحمن نیّر

مئی ۱۹۹۵ء
اشاعت کا ۵۹ واں سال
شمارہ ۵
قیمت ۱۲/- روپے
سیلز آفس
۴۲۲ ٹیا محل جامع مسجد
دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶
فون نمبر: ۳۲۵۵۱۷۴

فن اور فنکار

ہندوستان میں زرسالانہ:
پیشگی ۱۵۰/- بذریعہ رجسٹری ۲۲۵/- وی۔پی۔ ۱۶۰/- تاعمر ۲۰۰۰/-
غیر ممالک سے زرسالانہ:
بنگلہ دیش بری ڈاک ۲۱۰/- بذریعہ رجسٹری ۳۲۰/-
پاکستان بری ڈاک ۱۹۰/- بذریعہ رجسٹری ۳۰۵/-
پاکستان ہوائی ڈاک ۳۲۵/- بذریعہ رجسٹری ۴۵۰/- تاعمر ۴۰۰۰/-
دوسرے تمام ممالک سے ہوائی ڈاک سے ۴۱۰/- بذریعہ رجسٹری ۵۳۰/- تاعمر ۵۰۰۰/-

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ:
بیسویں صدی پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمٹیڈ بی۔۱۔ نظام الدین (ویسٹ)، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ فون: ۴۶۲۶۵۵۶ / ۴۶۴۲۱۰۴ / ۴۶۹۲۱۸۹

فن اور فنکار

"بیسویں صدی" میں شائع ہونے والے مواد میں نام، مقام و واقعات قطعی فرضی ہوتے ہیں ـــــ طابع و ناشر ضیاء الرحمٰن نیر" مطبوعہ اسٹار پرنٹنگ پریس فراشخانہ دہلی ۶۔ ٹائیٹل: شالیمار آفسیٹ پریس نئی دہلی ۲۔ مقام اشاعت: بی ۔۱، نظام الدین ویسٹ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

ادارہ
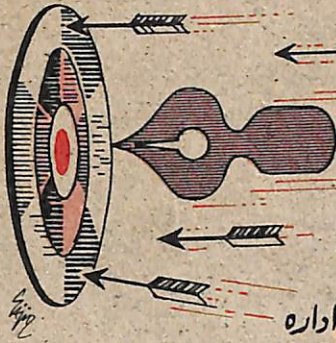
● "مرکزی بجٹ غریبوں کے حق میں ہے" — ایک بیان

— عام انتخابات سے عین پہلے کا بجٹ عموماً غریبوں کے حق میں ہوتا ہے۔ باقی کے چار برسوں میں امیروں کے حقوق کی جی جان سے حفاظت کی جاتی ہے

● "ارجن سنگھ نے جو مسائل اٹھائے ہیں وہ بنیادی اہمیت کے حامل ہیں" — ایک بیان

— لیکن کانگریس پارٹی میں بنیادی اہمیت مسائل کی نہیں قیادت کی ہوتی ہے

● "کیرالہ کے چیف منسٹر کرونا کرن نے استعفیٰ دے دیا" — ایک خبر

— بڑی دیر کی مہرباں جاتے جاتے

● "مہاراشٹر اور گجرات میں کانگریس کو شکست کا سامنا کرنا پڑا" — ایک خبر

— اور ہمیں یقین ہے کہ اس کے بعد بھی کانگریس پارٹی راہِ راست پر نہیں آئے گی۔

● "آئندہ ایک صدی تک ملک میں کانگریس کا کوئی متبادل پیدا نہیں ہو سکتا" — مسٹر نرسمہا راؤ

— لیکن ان دنوں کانگریس پارٹی کا جو حال ہے اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ کانگریس پارٹی پانچ سال بعد آنے والی صدی میں بھی شاید ہی باقی رہے گی۔

● "ارجن سنگھ کانگریس پارٹی میں پھوٹ ڈالیں گے" — مسٹر اٹل بہاری واجپائی

— مسٹر اٹل بہاری واجپائی نے یہ بیان یوں دیا ہے جیسے ارجن سنگھ بھارتیہ جنتا پارٹی کے کہنے سے کانگریس پارٹی میں پھوٹ ڈالیں گے۔

● "کانگریسیوں کو اپنے گریبان میں جھانکنا چاہئے" — ایک بیان

— گریبان میں کچھ ہو تو جھانکنے کا فائدہ بھی ہے۔ خواہ مخواہ ہی جھانکنے کا کیا فائدہ۔

● "مسٹر موہن سنگھ نے اپنی بجٹ تقریر میں اردو شعروں کا کم استعمال کیا" — ایک خبر

— آخر قوم کو کب تک اردو شاعری سے بہلایا جا سکتا ہے۔

● "پاکستان کے شہر کراچی میں قتل و غارت گری" — ایک سرخی

— اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ اسلام کے نام پر کیا جا رہا ہے۔

● "اقلیتوں نے حالیہ انتخابات میں کانگریس کو سبق دیا ہے" — شرد پوار

— یہ اور بات ہے کہ کانگریس پارٹی اس سبق کو بہت دیر تک یاد نہیں رکھے گی۔

● "آسمان سے آنے والی بلائیں" — ایک عنوان

— آدمی نے خود زمین پر اتنی بلائیں پیدا کرلی ہیں کہ اب بلاؤں کو آسمان سے بلانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

● "وشو ہندو پریشد ملک میں فرقہ وارانہ جنون کو بھڑکانا چاہتی ہے" — ایک بیان

— کیونکہ فرقہ وارانہ جنون ہی وشو ہندو پریشد کا من بھاتا کھاجا ہے۔

● "ارجن سنگھ کو اب پھر کانگریس میں داخلہ نہیں ملے گا" — وی ایس شکلا

— کیونکہ کانگریس کو اب سمجھدار لیڈروں کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

● "چور پکڑا گیا" — ایک عنوان

● "کانگریسیوں کا ضمیر مر چکا ہے"۔ — ایک بیان

ہمارا تو خیال ہے کہ ان کا ضمیر ہی نہیں ان کا مافی الضمیر بھی مر چکا ہے۔

● "کانگریس کے لیڈر مسٹر نارائن دت تیواری نے پارٹی کے عہدوں سے استعفیٰ دے دیا"۔ — ایک خبر

پارٹی پر بُرا وقت آن پڑے تو کانگریسی لیڈر اسی فراخ دلی سے استعفیٰ دینے پر اتر آتے ہیں۔

● "میں مرتے دم تک قوم کی خدمت کروں گا"۔ — ایک بیان۔

چاہے اس خدمت سے قوم کا دم ہی کیوں نہ نکل جائے۔

● "بمبئی شہر کا نام بدل دیا جائے گا"۔ — چیف منسٹر مہاراشٹر مسٹر منوہر جوشی

یوں بھی کام میں کیا رکھا ہے؟ سب کچھ تو نام میں ہی رکھا ہے۔

● "این ڈی تیواری کانگریس ورکنگ کمیٹی کی رکنیت سے اپنا استعفیٰ واپس لیں"۔ — ایک مطالبہ

کیونکہ کانگریسی لیڈر استعفیٰ دیتے ہی اس لیے ہیں کہ بعد میں انھیں واپس لیا جائے۔

● "کانگریس پارٹی کا مستقبل تاریک ہوتا جا رہا ہے"۔ — ایک بیان

لہٰذا کانگریسی لیڈروں سے ہماری یہ گزارش ہے کہ وہ اپنے شخصی مستقبل کو روشن بنانے کے لیے ابھی سے ضروری اقدامات کریں۔

● "نئی معاشی پالیسیوں سے امیروں کو فائدہ پہنچ رہا ہے"۔ — ایک بیان۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پرانی معاشی پالیسیوں میں غریبوں کا فائدہ ہو رہا تھا۔ معاشی پالیسی ہوتی ہی امیروں کے لئے ہے۔

● "ملک کا اتحاد اور سالمیت وقت کا اہم تقاضہ ہے"۔ — ایک بیان

ہمارے لیڈر عملی زندگی میں کرتے کچھ اور ہیں لیکن بیان دیتے وقت نہایت شریف اور محب وطن بن جاتے ہیں۔

● "بچے اپنی مادری زبان سیکھیں"۔ — ایک بیان

کاش کہ اردو بھی کسی کی مادری زبان ہوتی

● "اردو اکادمیاں کام نہیں کر رہی ہیں"۔ — ایک بیان

کچھ ادارے کام کرنے کے لئے نہیں بنائے جاتے بلکہ انھیں

ملک کے روز بروز بگڑتے ہوئے حالات سے وزیر اعظم کو تشویش۔ ایک خبر

اور اس واقعہ میں پولیس کی بہتر کارکردگی سے کہیں زیادہ پولیس کی بیوقوفی کو دخل ہوگا۔

● "ہندوستانی فلموں میں پاکستانی گانے شامل کئے جا رہے ہیں"۔ — ایک خبر

یہ اور بات ہے کہ دونوں ملکوں کے فلم ساز اپنی کہانیاں مغربی ادب سے چراتے ہیں۔

صرف دکھاوے کے لئے قائم کیا جاتا ہے۔

● "نوجوان قوم کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہیں"

ایک بیان

تبھی تو نوجوانوں میں گانجہ اور چرس جیسی نشہ آور چیزوں کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے۔

● "سینئر کانگریسی لیڈر بیانات جاری کرنے میں احتیاط سے کام لیں" — ایک بیان

لیکن اسے کیا کیجئے کہ اکثر کانگریسی لیڈر بیان دینے کے سوائے کوئی اور ٹھوس کام کر ہی نہیں سکتے۔

● "حکومت اقلیتوں کو خوش کرنے کی پالیسی پر عمل کر رہی ہے"

مسٹر کلیان سنگھ

اور اس پالیسی کا ثبوت وہ فرقہ وارانہ فسادات ہیں جو ملک میں آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔

● "معصوموں اور بے گناہوں کو سزائیں مل رہی ہیں"

ایک بیان

اس دنیا میں تو یہی ہوگا۔ گنہگار حضرات سزا پانے کے لئے دوسری دنیا میں جانے کا انتظام کریں۔

● "سچائی کی فتح ہوگی" — ایک عنوان

سچائی کے بارے میں یہ جھوٹ نہایت عام ہو چکا ہے۔

● "اسمبلی الیکشن میں کانگریس کو کراری چپت' پھوٹ بڑھتی جا رہی ہے" — ایک خبر

اس لئے کہ ملک میں پھوٹ سستی ملتی ہے۔

● "تین بچوں کو زہر کھلا کر مار دیا" — ایک خبر

بھوکے وہ پھر بھی نہیں مرے۔

● "بارات اسپتال پہنچ گئی" — ایک خبر

کسی ڈاکٹر یا نرس کی شادی ہو رہی ہوگی۔

● "انکم ٹیکس کی ادائیگی میں سہولت' افسران ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ جائیں گے" — ایک خبر

بوگس چھاپوں کا چلن عام ہو جائے گا۔

● "مہنگائی کی رفتار" — ایک عنوان

ماشاءاللہ بہت تیز ہے۔

بمبئی میں داخلہ پرمٹ تجویز کی گونج پارلیمنٹ میں — ایک خبر

● "ہولی کے دن رنگ میں بھنگ"

ایک پنتھ دو کاج ہاتھ بھی رنگے اور بھنگ کا مزہ بھی چکھ لیا۔

● "فرقہ پرستوں کو سر اٹھانے کی اجازت نہیں دی جائے گی"

ایک عنوان

بدنصیبی کی بات یہ ہے کہ ملک کی کئی ریاستوں میں یہی فرقہ پرست برسرِ اقتدار ہیں۔

●●

پروفیسر عنوآن چشتی

پروفیسر ظفر احمد نظامی

صدر شعبۂ سیاسیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

کشادہ پیشانی، ذہانت کی نشانی۔ چہرے پر نکھار، آنکھوں میں خمار ہونٹوں میں تبسم، خیالوں میں گم، سر پر لمبے بال، پیکرِ جمال۔ یہ ہیں عنوانِ ہستی یعنی افتخار الحسن عنوآن چشتی۔

عنوان صاحب ۵ر فروری ۱۹۳۷ء کو اس دنیا میں آئے اور شاہ سید انوار الحسن کی آنکھوں کا نور کہلائے۔ دو بار ایم اے کیا پھر ریسرچ کی۔ غرضیکہ ایسے ہی مراحل میں نوجوانی خرچ کی۔ بڑے پڑھے لکھے انسان ہیں تبھی تو علم و ادب کا عنوان ہیں۔ پہلے جغرافیہ کے شیدائی ہوئے بعد ازاں اردو کے سودائی ہوئے۔ غالب کے شہر اکبر آباد میں مدرسی کا پیشہ اختیار کیا پھر ذوق وظفر کی دلی پہنچ کر ذاکر صاحب کی جامعہ ملیہ اسلامیہ سے عہدِ وفا استوار کیا۔ علم وفن کی خوشبو سے معطر ہو گئے۔ لکچرر سے ریڈر بنے پھر پروفیسر ہو گئے۔ شعبۂ اردو کے صدر بنے۔ پہلے نجم تھے۔ پھر بدر بنے۔ ہیومنٹیز اینڈ لنگویجز کی فیکلٹی کے ڈین رہے۔ اب شعبۂ اردو کے صدر ہیں۔ اور آستانۂ شاہ ولایت منگلوری کے سجادہ نشین ہیں۔

شاعری سے دل لگایا، بارہ برس کی عمر میں پہلا شعر بنایا۔ تیرہ برس کی عمر میں پہلی مرتبہ غزل کہی جو "ملاپ" کے صفحات پر محفوظ رہی پھر ذہن میں "سلام اے مسافر" نامی نظم کھلی جسے "شاعری" کے دامن میں جگہ ملی۔ اس کے بعد اب تک برابر شعر کہہ رہے ہیں اور دریائے اصنافِ سخن میں بہہ رہے ہیں۔ اگرچہ مکتب استادی و شاگردی کے قائل ہیں اور مولانا ابر احسنی کے تلامذہ میں شامل ہیں تاہم وہ لکیر کے فقیر نہیں۔ روایتوں کے اسیر نہیں خود اپنے لئے راہیں نکالتے ہیں، نئے انداز کے اشعار ڈھالتے ہیں، کبھی عروض کے فیتے سے شعروں کو ناپتے ہیں، کبھی غزل کو دل پر چھاپتے ہیں۔ کبھی تحقیق کے دریا میں غوطے لگاتے ہیں کبھی تنقید کے تیر چلاتے ہیں۔ نامور ادیب ہیں، بلا کے خطیب ہیں۔ روانی سے بولتے ہیں، ادب کے مسائل کی گرہیں کھولتے ہیں۔ "صاحبِ کتاب" ہیں جن کی تصانیف لاجواب ہیں۔ بے شمار اداروں سے وابستہ ہیں، شعر وفن کا گلدستہ ہیں ـــــ تصوف کے سائے میں پلے ہیں، صوفیوں کی صحبتوں میں ڈھلے ہیں۔ جماعتِ صوفیا کی شان ہیں۔ غرضیکہ ؎

رہرو راہِ علم وفن ہیں یہ
صرف گل ہی نہیں، چمن ہیں یہ
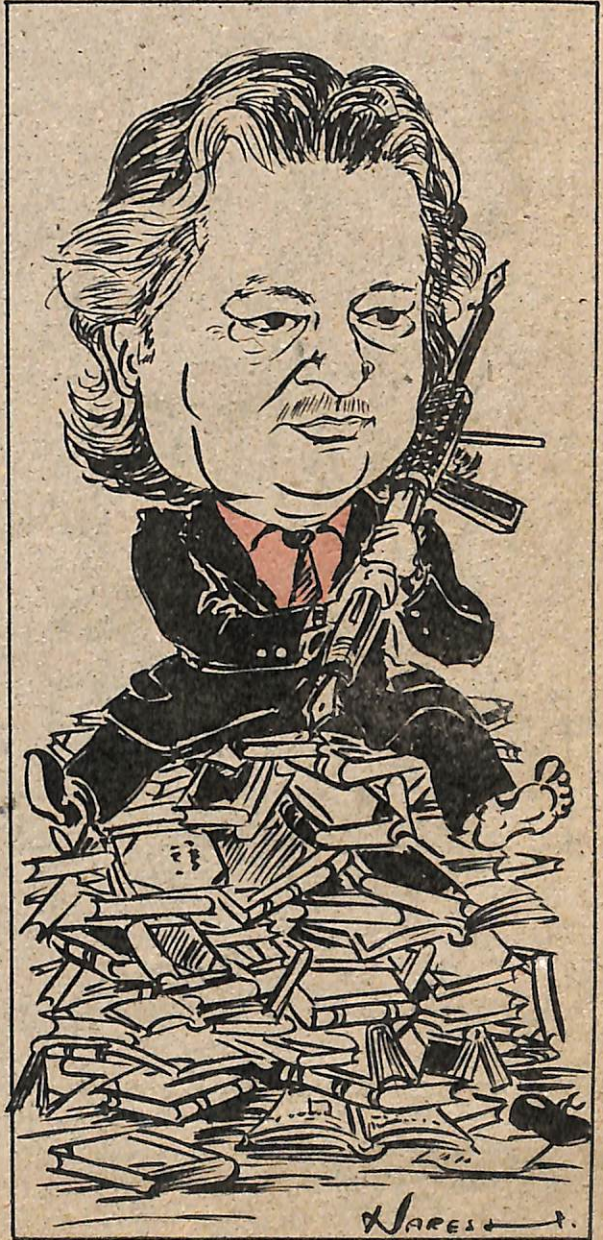
دہلی اردو اکادمی کے نام

مؤذن مرحبا برقت بولا
تری آواز مکّے اور مدینے

بیسویں صدی اُردو کے کثیر الاشاعت رسالوں میں ہے اور اس کی آواز دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچتی ہے۔ جہاں تک اردو زبان کے قاری موجود ہیں۔ ماضی میں بھی ایسا ہوا ہے کہ مصلحت وقت کی زنجیروں سے آزاد اس رسالے نے فکر انگیز اداریے اور خطوط شائع کئے ہیں۔ آج پھر ایک اہم مسئلہ کو چھیڑا ہے جس کے لئے ادارہ قابل مبارکباد ہے۔

اردو زبان کی ہندوستان میں (آزادی کے بعد) آئینی حیثیت اور اس پر عمل درآمد اور اردو دستخطوں کی مہم کا تاریخی حوالہ دیتے ہوئے ادارہ بیسویں صدی نے اس دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہے کہ مفاد پرستوں نے ہمیشہ اردو کے سوالات کو "ٹال مٹول" میں ڈالنے کے گھناؤنے اقدامات کئے۔ راقم الحروف لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کانفرنس میں موجود تھا جب کانفرنس کے کرتا دھرتا حضرات نے عمداً اردو کے مسئلہ سے چشم پوشی کی اور جب زیادہ عوامی زور پڑا تو اس سلسلے میں سردار جعفری کمیٹی تشکیل کر دی گئی اور اس طرح اس قرارداد کو التوا میں ڈال دیا تھا جو اردو کے حقوق کے تحفظ کے لئے پیش کی جانے والی تھی۔ جیسا کہ توقع تھی۔ سردار جعفری کمیٹی کی کوئی رپورٹ آج تک منظر عام پر نہیں آئی۔

یہ تو خیر برسبیل تذکرہ تھا۔ بیسویں صدی کے اداریے میں سب سے اہم بات جو سامنے لائی گئی ہے وہ دہلی اردو اکیڈیمی کی کارکردگی کے متعلق ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بی جے پی حکومت نے آتے ہی اپنے رنگ ڈھنگ دکھانے شروع کر دیئے تھے جن لوگوں کو انعامات برائے ۹۳ء دیئے تھے۔ ان کو ایک سال انتظار کرنا پڑا۔ اب گرانٹ آتی ہے اور اب آتی ہے — اور جب گرانٹ آئی تو بیسویں صدی کے اس انکشاف پر حیرت ہوئی کہ بیس لاکھ روپے کی رقم واپس کر دی تھی اگر یہ صحیح ہے تو بڑی افسوسناک بات ہے۔ ہزاروں کام ہیں جو اردو اکیڈیمی کو کرنے چاہئیں مگر اکیڈمی نہیں کر رہی ہے۔ کتابوں کے لئے اشاعتی امداد ایسی شرائط پر دی جاتی ہے جیسے ادیب اور شاعر چور ہوں۔ اور ادارے بھی ہیں جو اشاعتی امداد دیتے ہیں مگر اس طرح نہیں۔ پڑھنے والوں کو شاید حیرت ہو کہ امدادی رقم دینے سے پہلے جلد سازی کی دوکان پر جا کر کتاب سازی کی، قیمت معلوم کی جاتی ہے۔ پھر پچیس کتابیں مفت "لی جاتی ہیں"، قیمت پر کنٹرول الگ ایسی شرائط کسی اور ادارے میں نہیں۔ چاہے فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی ہو یا اردو اکیڈمی (یوپی)، یا ترقی اردو بورڈ — اس سے اچھی تو دہلی کی ہندی اکیڈیمی ہے کہ کتاب کا مسودہ پاس کرنے کے بعد مصنف سے کہتی ہے کہ آپ کتاب چھاپ لیجئے ہم مقررہ قیمت پر اتنے ہزار روپے کی کتابیں خرید لیں گے۔

اگر یہ بات عرض کی جائے کہ شاعروں اور سمیناروں میں احباب پروری کی جاتی ہے تو شاید غلط نہ ہو۔ بہر حال یہ ایک ایسا سوال ہے کہ باقاعدہ غیر جانبدارانہ انداز سے اکیڈیمی کے کام کرنے کے طریقوں پر جانچ کی ضرورت ہے۔

اردو اکیڈیمی نے ماضی میں ایک کام اپنے سر لیا تھا کہ اردو اسکولوں میں عارضی طور پر اردو ٹیچر مہیا کرے گی تا کہ طلباء کا نقصان نہ ہو۔ وہ اس وقت اس لئے کیا کہ اردو ٹیچروں کے تقرری میں دشواریاں پیدا ہو رہی تھیں۔ بالکل عارضی انتظام تھا۔ مگر افسوسناک حقیقت ہے۔ گزشتہ دس سال سے یہ زیادتی اردو ٹیچروں کے ساتھ ہوتی آ رہی ہے کہ اردو اکیڈمی جن ٹیچروں کو اپنے فنڈ سے تنخواہ دے کر اردو اسکولوں میں بھیجتی ہے۔ ان کا کام اور قابلیت تو وہی ہوتی ہے جو محکمہ تعلیم کے مقرر کردہ ٹیچروں کی۔ مگر ان کو تنخواہ بہت کم دی جاتی ہے۔ آج T. G. T. ٹیچر کی کم سے کم تنخواہ مع گرانی الاؤنس کے ڈھائی ہزار روپیہ ہے۔ مگر T. G. T. کے مساوی قابلیت رکھنے والی جو ٹیچریں اردو اکیڈمی کے طرف سے وہی کام کرنے کے لئے رکھی جاتی ہیں ان کو بہت کم تنخواہ دی جاتی ہے۔ بہت سے بہت چھ یا سات سو۔ پھر گرمیوں کی چھٹیوں کی تنخواہ نہیں ملتی اور یہ ٹیچر ان دیگر مراعات سے محروم ہیں جو سرکاری قوانین کی رو سے ٹیچروں کو دی جاتی ہیں۔ کیا اردو اکیڈمی چلانے والوں کا یہ فرض نہیں ہے کہ اگر ان کے پاس بیس لاکھ روپیہ بچ گیا ہے (یا بچا دیا گیا ہے) تو ان اردو ٹیچروں کے ساتھ انصاف کریں جو نئی نسل کی تربیت کر رہی ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اگر اس عارضی اقدام کو جاری رکھا تھا تو تنخواہ میں امتیازی سلوک نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ مجبوروں کی مجبوری کا فائدہ نہ اٹھانا چاہیئے تھا۔ مگر افسوس جب بیس لاکھ روپیہ واپس کیا گیا تو کیا ان مجبور اردو ٹیچروں کی اگلی تنخواہ پچھلے گریڈ کے حساب سے دے کر سرخروئی حاصل نہیں کی جانی چاہیے تھی مگر ہوا کیا ۔! آج جو روپیہ واپس کیا گیا وہ گویا

ہمیشہ کے لئے واپس ہوگیا۔ اب اگلے بجٹ میں کٹوتی کی راہ ہموار ہوگئی۔

ایک مسئلہ کتابوں کی خریداری بھی ہے۔ بی جے پی کی حکومت سے پہلے تک اردو اکیڈمی اردو اسکولوں کی لائبریری کے لئے کم از کم بیس پچیس کتابیں خریدتی تھی اور اس سے زیادہ بھی۔

مگر اب ایک کتاب کی اتنی کاپیاں خریدی جاتی ہیں جن کی مجموعی قیمت تین سو روپے سے زیادہ نا ہو۔ ہمارا تو خیال ہے کہ بجٹ میں کمی ہوگی۔ مگر بیسویں صدی کے اداریے نے آنکھیں کھول دیں کہ بیس لاکھ روپے اردو اکیڈمی نے واپس کئے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو بہت افسوسناک بات ہے۔ اور اردو والوں کے حق پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف ہے۔

رفعت سروش، نوئیڈا

● واضح ہو کہ "بیسویں صدی" کے تازہ شمارے کے موصول ہونے سے ایک روز قبل ہفتہ وار "ہماری زبان" بابت ۸ر مارچ ۹۵ء زیر مطالعہ آیا۔ جس میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری اور ایڈیٹر جناب خلیق انجم نے اداریہ "اردو اداروں کے نااہل سربراہ" کے عنوان سے سپرد قلم کیا ہے۔ موصوف نے جہاں دوسرے اداروں پر اس طرح اعتراض کیا ہے:

"سب سے بدتر وہ اکیڈمیاں اور ادارے ہیں جو معقول بجٹ ملنے کے باوجود اردو کے لئے کوئی کام نہیں کرتے۔ ان اداروں کے سربراہ کچھ رقم اپنی اور اپنے اسٹاف کی تنخواہوں پر خرچ کرتے ہیں اور کچھ رقم کاروں اور ٹیلیفونو کی آسائش پر صرف ہوتی ہے اور باقی رقم ایمانداری سے حکومت کو واپس کر دی جاتی ہے۔"

وہیں دہلی اردو اکیڈمی کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے:

"ہمیں دہلی اردو اکیڈمی کا تجربہ ہے چونکہ اس اکیڈمی نے شروع سے آج تک اردو کی ترقی اور فروغ کے لئے مختلف میدانوں میں کام کیا ہے اس لئے ہر سال بجٹ کم پڑتا گیا اور آج یہ بجٹ تقریباً ۵۵ لاکھ ہے۔"

اس کے برعکس "بیسویں صدی" کے شمارہ اپریل میں آپ کا اداریہ "دہلی اردو اکادمی کی اردو دشمنی" چونکانے والا ہے۔ آپ نے حقائق کا پردہ چاک کرتے ہوئے نہ صرف دہلی اردو اکادمی کی کارکردگی پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے بلکہ اردو کے موجودہ ابن الوقتوں کے منہ پر طمانچہ رسید کیا ہے۔ یہ پڑھ کر نہایت افسوس ہوا کہ منظور شدہ بجٹ میں سے ۲۰ لاکھ روپے بغیر خرچ کئے اس نے دلّی انتظامیہ کو واپس کر دیئے ہیں۔ خلیق انجم صاحب کا وتیرہ سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ ان کے قول و فعل میں کتنا تضاد ہے۔ یہ اداریے سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ خدا اردو کو ایسے ہی خواہوں سے محفوظ رکھے۔ پچھلے دنوں انھوں نے اخبار میں ٹونک سے متعلق انجمن ترقی اردو کی ایک فرضی شاخ کی خبر بھی شائع کی تھی جب کہ ٹونک میں ۱۹۳۷ء سے انجمن ترقی اردو کی شاخ اپنے کاموں میں منہمک و معروف ہے۔

بہرحال آپ شکریہ کے مستحق ہیں کہ آپ نے ایسا بھرپور اداریہ لکھا۔

مختار ٹونکی
ٹونک

قارئین سے گذارش

"دہلی اردو اکادمی میں" ہونے والی بدعنوانیوں گھپلوں اور بے ضابطگیوں کے سلسلے میں ہمیں بہت سے خطوط ملے ہیں۔ چند کے اقتباسات شائع کئے جا رہے ہیں۔ قارئین بیسویں صدی اگر اپنے خیالات پیش کرنا چاہیں تو بیسویں صدی کے صفحات حاضر ہیں۔ سکریٹری دہلی اردو اکادمی اپنی صفائی میں اگر کچھ کہنا چاہیں تو اس کا بھی استقبال کیا جائے گا۔

ایڈیٹر

● بیسویں صدی کے تازہ شمارے میں دہلی اردو اکادمی کے تعلق سے جو مدلّل اور جامع اداریہ لکھا گیا ہے اس کے لئے مبارکباد۔ حقیقت یہ ہے کہ میں عرصہ دراز سے اردو اکادمی پر نظر رکھے ہوئے ہوں اس کی کارکردگی سے بخوبی واقف بھی ہوں۔ معمولی سی ان کتابوں پر جس سے نہ اردو کو کوئی فائدہ ہوگا نہ اس کے قاری یا ادب کے طالب علم کو۔ صرف اس لئے چھاپی گئیں تاکہ آسانی سے فنڈ کو ختم کیا جاسکے۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ایسے اقدام اٹھائے جائیں جن سے اچھی اور معیاری کتب شائع کی جائیں جن سے اردو کا چلن عام گھرانوں میں ہو جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کی ہزاروں کتابیں نایاب ہیں۔ مولوی کریم الدین پر کوئی کام نہیں ہوا، ان کی کتابیں فراہم نہیں ہیں۔ کیا اردو اکادمی ان کو نہیں چھاپ سکتی تھی؟ چند لوگوں کا ایک گروہ ہے، جس نے اردو اکادمی کو اپنا غسل خانہ سمجھ رکھا ہے، اور ہر قسم کی غلاظت اس میں کتاب کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول اور کتابیں راشد الخیری کے ناول مرزا فرحت اللہ بیگ کی تصنیفات، جو ایسی بھی ہیں کہ ابھی تک مسودوں کی صورت میں ہیں۔ ان کو چھاپنے کی اشد ضرورت تھی۔ مذاق یہ ہوا کہ مضامین فرحت کا نہایت ناقص انتخاب چھاپا گیا۔ مرتّب کو سارے مضامین نہیں ملے یا انھوں نے جمع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ جو ادھر اُدھر سے ہاتھ آ گیا، چھاپ دیا۔ اہم مضامین چھانٹے نہیں گئے۔ بلکہ جمع کرنے کی زحمت بھی نہیں کی گئی۔ ۱۸۵۷ء کا اتنا بڑا تاریخی واقعہ دلّی میں ہوا۔ اس پر کوئی دستاویزی کتاب اردو اکادمی نے شائع نہیں کی۔ دلّی اردو اخبار اور داستانِ غدر، جن کی بڑی تاریخی اہمیت ہے، ان کے نام سے اردو اکادمی واقف نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی صد سالہ یادگار کے طور پر اتر پردیش اردو اکادمی نے الہلال کے سارے پرچے چھاپ دیئے۔ لیکن دلّی اردو اخبار، مولوی باقر علی، اور امام بخش صہبائی جیسے اردو کے پہلے شہدائے آزادی کی نایاب تصنیفات چھاپنے کی بات تو دور

کی ہے، ان کے بارے میں ایک سمینار تک نہیں کیا گیا۔ حالانکہ نثری نظم جیسے لایعنی، موضوعات پر لاکھوں روپے خرچ کر کے سمینار کئے گئے۔

دہلی کے وزیر اعلیٰ شری مدن لال کھورانہ بہت ذہین اور اچھے منتظم ہیں ان کو اردو اکادمی کے معاملات کو ذاتی طور پر دیکھنا چاہئے کیوں کہ اردو اقلیت کی زبان ہے اور اقلیتوں کے ووٹ کسی بھی پارٹی کے لئے اہمیت رکھتے ہیں اسی طرح ہندی اکادمی کا معاملہ ہے اس کی بھی حالت اردو اکادمی سے کچھ مختلف نہیں ہندی ہماری قومی زبان ہے اس پر نگاہ رکھنا بھی ہمارا قومی فریضہ بن جاتا ہے مجھے یقین ہے کہ یہ سب معاملات ایک نہ ایک دن وزیر اعلیٰ کے روبرو پیش کئے جائیں گے اور تب دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔

ثمر کمال، دہلی

● بیسویں صدی کا تازہ شمارہ (اپریل ۹۵) موصول ہوا۔ جہاں تک مواد کا تعلق ہے شعری حصّہ کچھ پھیکا ہے۔ جب کہ نثری حصّہ زیادہ جاندار ہے۔ ہیرانند سوز، موہنی مجروح، شمع کاکوری کے افسانے پسند آئے۔ حرفِ اقرار اور روزی دیدی کے افسانے بھرتی کے ہیں۔ ہوئے ڈر کے ہم جو رسوا، لطیف مزاح پیدا کرنے میں کامیاب ہے۔ پروفیسر ظفر احمد نظامی نے "قلمی چہرے" کے تحت مجروح سلطانپوری کی شخصیت کی صحیح عکاسی کی ہے۔ پروفیسر ظفر احمد نظامی کی نثر پڑھنے سے اردو کی ابتدائی نثر کی یاد تازہ ہو گئی۔ دلیپ سنگھ کا مضمون "تیری سرکار میں پہنچے" بھی کافی دلچسپ ہے۔ لیکن ان تمام کے باوجود اس شمارے میں سب سے اہم اور دلچسپ "اداریہ" ہے۔ جس پر تبصرہ نہ کرنا انصاف کا خون ہوگا۔ دہلی اردو اکادمی کی اردو دشمنی پر آپ نے اشاروں کنایوں میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ آپ کی بے باک صحافت اور اردو دوستی کی مثال ہے۔ اردو اکادمی گذشتہ ڈیڑھ برس سے جو کچھ کر رہی ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ دہلی کی بی جے پی حکومت کے سامنے سرخرو ہونے کے لئے اکادمی اردو کا جو نقصان کر رہی ہے وہ ناقابل تلافی ہے۔

اکادمی ہر سال دہلی کی یونیورسٹیوں میں پہلی، دوسری اور تیسری پوزیشن لانے والوں کو انعامات سے نوازتی ہے۔ اس بار سال (۹۵-96) ختم ہونے کو آیا ہے لیکن اکادمی کا دھیان ادھر ہے ہی نہیں۔ فضول کاموں میں روپے کا بے جا مصرف جاری ہے۔

اسلم جمشید پوری - دہلی

● بیسویں صدی ماہ اپریل ۹۵ شمارہ میں آپ کا اداریہ پڑھا، آپ نے جس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے، ضرورت ہے کہ ہمارے شعراء ادباء اس روشنی میں اپنا کوئی لائحۂ عمل طے کریں اور صرف اردو اکادمی ہی نہیں بلکہ دیگر مسائل بھی تحریکی انداز میں سامنے آئیں، صرف تخلیقی محاذ پر ہی ہماری جو کسی کافی نہیں اگر آپ اسی طرح اداریہ کے سلسلے کو مستقل کر دیں تو بہت اچھی بات ہوگی۔

افسانے اچھے ہیں لیکن نثار راہی، شمع کاکوروی، ہیرانند سوز، موہنی مجروح کے افسانے خاص طور پر متاثر کرتے ہیں بیسویں صدی میں پہلی بار کرشن موہن کی آزاد غزل دیکھ کر مسرت ہوئی۔ ویسے غزلوں میں جناب راز اندمانی، نعمان شوق، کمال الدین کمال، ڈاکٹر حنیف ترین، قاضی حسن رضا، فاروق انوار مرزا اور ڈاکٹر آفاق فاخری پسند آئے۔

اظہر نیّر
برہولیا دربھنگہ

● "بیسویں صدی" ملا - اردو اکادمی پر تاثرات پڑھ کر سکون ہوا کہ اب سنجیدہ حلقہ بھی اردو کے مجاوروں کی حقیقت سمجھ گیا ہے جب تک ان کے چہروں سے نقاب نہیں اٹھے گی یہ سفید پوش دلال اسی طرح اردو زبان سے اپنی خدمت کراتے رہیں گے۔ آواز کے جادو پہ غزل دوڑا کر یہ لوگ دور دراز کا سفر کر کے دولت بٹورنے میں لگے رہتے ہیں اور کالج میں طلبا ان کے دیدار سے محروم رہتے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سانٹھ گانٹھ کر کے اردو اکادمیوں میں گھس گئے ہیں اور اس زبان کی مٹی پلید کر رہے ہیں۔ اردو کے جریدوں پر قابض رہنا چاہتے ہیں۔ اعزازی رسائل چاہتے ہیں۔ ان میں کچھ بھی خدمت کا جذبہ ہو تو اردو کے رسائل کے سیکڑوں خریدار بنا سکتے ہیں مگر دبئی، کویت، شارجہ کی دولت سے بنگلہ تیار کراتے ہیں اور کار میں گھومنا پسند کرتے ہیں۔ چند غزلیں ایک سال تک مشاعروں میں سنا کر ہر جگہ اعلان کرتے ہیں کہ یہ غزل صرف اس مشاعرے کے لئے ہوگئی ہے کاش آپ کی طرح دوسرے جرائد بھی ان کے کرتوتوں کو عوام اور اردو کے قاری کے سامنے پیش کر کے ان کا اصل چہرہ دکھا دیں جو کالی پیلی غزلیں کہہ کر آنے والی نسلوں کی راہ میں کانٹے بچھا رہے ہیں۔

علی عرفان زیدی —— رامپور

● تازہ "بیسویں صدی" (اپریل ۹۵ء) ملا۔ اس میں آپ کا اداریہ "اردو اکادمی دہلی کی اردو دشمنی" پڑھ کر سخت افسوس ہی نہیں بلکہ صدمہ ہوا کہ اردو کی روٹی کھانے والے بھی اردو کے ساتھ دشمنی کا رویہ روا رکھے ہوئے ہیں۔ گویا یہ روایت بہت پرانی ہے۔ جب اعلیٰ ترین مناصب والے ہی اردو کے خلاف رہے ہوں تو نسلِ نو سے کیا توقع رکھی جا سکتی ہے؟ بتائیے ڈاکٹر راجندر پرساد سے لے کر آنجہانی راجیو گاندھی تک نے اردو کو اس کا جائز مقام نہ دلائے جانے کا تہیہ کر رکھا تھا تو پھر آج کل کے رہنماؤں اور صاحبانِ اقتدار کے تو تیور اور بھی خطرناک ہیں —— لے دے کر اردو اکیڈمیاں اشک شوئی کے لئے کھڑی کی گئی تھیں، اب ان سے بھی اردو دشمنی کا کام لیا جانے لگا! یہ تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا —— دہلی اردو اکادمی کے سلسلے میں آپ کا مطالبہ بالکل جائز اور قابل قبول ہے۔ مگر یقین کیجئے کہ روپے بچا کر دینے والے ہی حکومت کی نظر میں وفادار اور بہی خواہ تصور کئے جائیں گے!! کم از کم اردو کے سچے بہی خواہوں کو متحد ہو کر آواز تو ایوانِ بالا تک پہنچانی ہی چاہئے۔

ادھر یوپی میں ملائم سنگھ جی نے اردو کا رشتہ روزی روٹی سے جوڑنے کی عملاً کوشش شروع کی ہے تو متعصب اذہان ان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے۔ ہر ہر قدم پر روڑے اٹکائے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کی "منہ بھرائی" کی دہائی دی جا رہی ہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ مردِ آہن ہنوز میدانِ عمل میں ڈٹا ہوا ہے جب کہ یہ بات ان کے بہت سے رفقائے کار کو بھی پسند نہیں ہے۔ ایسے حالات میں جتنا ملائم سرکار نے کیا ہے

خود پسندی اور انانیت کے شکنجے میں جکڑی ہوئی

بے چاری دہلی اُردو اکادمی

دہلی اردو اکیڈمی گزشتہ ڈیڑھ سال سے خود پسندی اور انانیت کے زیر سایہ سسک رہی ہے۔ زبیر رضوی اس کے سکریٹری ہیں مگر شاید انھوں نے خود کو اس کا مالک سمجھ رکھا ہے۔ اردو اکیڈمی کا سکریٹری اکیڈمی کے آئین کی رو سے گورننگ کونسل کے فیصلوں پر عمل کرنے اور کرانے کے لئے ہوتا ہے مگر زبیر رضوی گذشتہ عرصہ میں یا یوں کہئے کہ جب سے زبیر رضوی کو اردو اکیڈمی کا سکریٹری مقرر کیا گیا ہے تب سے اب تک گورننگ کونسل زبیر رضوی کی اطاعت گذار باڈی بن کر رہ گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سکریٹری کے عہدے پر اپنی تقرری سے قبل (اور شاید ابھی تک) زبیر رضوی نے اکیڈمی کے آئین کا مطالعہ ہی نہیں کیا اور اگر کیا ہے تو ان کی انا اور خود پسندی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ گورننگ کونسل کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس سے فیصلہ کروا کر ان فیصلوں پر عمل کریں۔

گورننگ کونسل کو وہ کس قدر حقیر اور بے وقعت چیز سمجھتے ہیں اس کا اندازہ تقرری کے بعد کے ان کے فیصلوں اور اقدامات سے بخوبی لگ سکتا ہے۔ گرچہ سکریٹری کی تقرری اور گورننگ کونسل کی تشکیل کم و بیش ایک ساتھ ہوئی مگر زبیر رضوی نے اردو اکیڈمی کے ماہنامہ "ایوانِ اردو" میں اپنی بہت بڑی تصویر کے ساتھ اپنی تقرری کی خبر شائع کی اور گورننگ کونسل کی نامزدگی کی خبر کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ جب راقم الحروف نے اس کوتاہی کی جانب ان کی توجہ مبذول کرائی تو انھوں نے شاید بدرجہ مجبوری گورننگ کونسل کے ارکان کے نام ایوان اردو کے بعد کے شمارے میں شائع کروائے لیکن کونسل کے ارکان کی سماجی اور ادبی حیثیت کو ہمیشہ راز ہی میں رکھا جب کہ اپنی خبریں انھوں نے سرکاری ملازمت کے سلسلے میں کھیل کے بین الاقوامی مقابلوں میں ریڈیو کی ڈیوٹی پر جانے کی تفصیل اس طرح شائع کی تھی گویا ہانگ کانگ یا سیول جانے سے ان کا ادبی قد بہت اونچا ہو گیا ہے۔ زبیر رضوی نے اکیڈمی کے آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے من مانے طریقے پر اکیڈمی کی مختلف کمیٹیاں بھی بنا ڈالیں مثلاً تعلیمی کمیٹی، اشاعتی کمیٹی، مشاعرہ کمیٹی، انعام و اکرام کا فیصلہ کرنے والی کمیٹی اور سمینار کمیٹی وغیرہ وغیرہ۔ واضح رہے کہ اکیڈمی کے آئین میں واضح طور پر یہ کہا گیا ہے کہ ان کمیٹیوں کی تشکیل گورننگ کونسل کے ارکان کثرت رائے سے کریں گے لیکن زبیر رضوی نے "کثرت جذبات" سے نہایت

اور مزید کرنے کا عزم کر رکھا ہے اسے قابل مبارکباد اور مستحسن کام خیال کیا جانا چاہیے۔ موصوف کے کام کو سراہنا چاہیے اور اردو سے ذرا سی بھی ہمدردی رکھنے والوں کو ان کے ہاتھ مضبوط کرنے چاہئیں۔

مختصر یہ کہ جب خدا کو کوئی کام کرانا ہوتا ہے تو ہر کسی سے کرا لیتا ہے۔ اردو کے لئے کام کرنے والے کا انتخاب "ملائم سنگھ" کی صورت میں ہی کر لیا ہے شاید! خدا ملائم سنگھ جی کو حوصلہ، استقلال اور وسائل سے نوازے اور دیگر اردو بولنے والے صوبوں میں بھی ملائم سنگھ جیسے مجاہدین کو برسرِ اقتدار لائے، آمین۔

عزیز مرادآبادی
بستی کرت پور، بجنور

ادب

● رام لعل کا کوچۂ قاتل بہت توجہ و انہماک سے پڑھتا ہوں۔ کیسی حقیقت نگاری انھوں نے کی ہے۔ ایک سچے ادیب کا یہی معیار ہے میں بھی اس عہد کے اس کربناک اور المناک حادثات کا ایک عینی شاہد ہوں۔ کبھی کبھی انھیں خون سے نہائی ہوئی عمارات پر نظر کرتا ہوں یا ان ٹرینوں کے پائیدانوں کا تصوّر جب ذہن میں ابھرتا ہے جن پر انسانوں کا خون کتھے کی مانند جما ہوا نظر آتا ہے تو میں کھو سا جاتا ہوں۔ بیسویں صدی میں تقریباً پچاس سال سے پڑھ رہا ہوں۔ اور طالب علمی کے دور سے اب تک نہ جانے کتنی غزلیں میری بھی اس میں شائع ہو چکی ہیں۔ الحمدللہ اس کے معیار میں کوئی تنزّلی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔

آپ سے جدّہ میں راشد صدّیقی کے یہاں استقبالیہ میں ملاقات ہوئی تھی جسے آپ کے اعزاز میں دیا گیا تھا۔ شاید آپ بھول بھی چکے ہوں۔ بہر کیف اکثر اوقات آپ کا خیال آتا رہتا ہے۔ اللہ آپ کو زندہ و سلامت رکھے۔

واصل عثمانی ——— دمّام

● "بیسویں صدی" کا سالنامہ بھنڈی بازار

غیر آئینی انداز میں ان کمیٹیوں کی تشکیل کر ڈالی۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ گورننگ کونسل کے کسی بھی فاضل رکن نے ان کے اس اقدام پر انگلی تک نہ اٹھائی۔

لیفٹیننٹ گورنر نے زبیر رضوی کو گورننگ کونسل کے پہلے ہی جلسے میں میری درخواست پر یہ حکم دیا تھا کہ وہ اکیڈمی کے آئین کی کاپیاں ممبروں کو دے دیں لیکن موصوف نے ایک سال تک مجھے اکیڈمی کے آئین کی کاپی نہیں دی بالآخر لفٹیننٹ گورنر کی صدارت میں اکیڈمی کی گورننگ کونسل کے آخری جلسے میں راقم الحروف نے شکایت کی اور لفٹیننٹ گورنر نے زبیر رضوی کی سرزنش کرتے ہوئے کہا کہ وہ فوراً اکیڈمی کے آئین کی ایک کاپی پروانہ ردولوی کو دیں۔ زبیر رضوی نے کہا کہ میرے پاس صرف ایک کاپی ہے۔ گورنر نے کہا کہ اس وقت اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی کروا کے پروانہ ردولوی کے حوالہ کرو۔ زبیر رضوی نے ایسا ہی کیا یعنی پورے ایک سال بعد انھوں نے اپنے صدر کے حکم پر عمل کیا اور اس ایک سال تک میں گورننگ کونسل کا رکن ہوتے ہوئے بھی اپنے اختیارات سے باقاعدہ طور پر باخبر نہ ہوسکا۔

زبیر رضوی نے عارضی اسٹاف کی تنخواہوں میں اضافہ اور ایوانِ اردو کے کارگذار ایڈیٹر مخمور سعیدی کی تنخواہ کا اسکیل طے کرنے کے سلسلے میں بھی اکیڈمی کے صدر (لفٹیننٹ گورنر) کو اپنا نوٹ ایک سال تک نہیں بھیجا اور گورننگ کونسل کو اس سلسلہ میں بالکل بے خبر رکھا۔ انھوں نے میٹنگوں کی کارروائیوں کو بھی اس قدر توڑ مروڑ کر اپنی خواہشات کا عکس بنا کر پیش کیا کہ کم از کم مجھ جیسے آدمی کے لئے ان میں اصلاح کرنا ممکن نہیں رہ گیا۔ ان کے زمانے میں اردو اکیڈمی ''ناٹیہ کلا پریشد'' بن گئی۔ بجٹ میں تخفیف ہوئی۔ غلطیوں سے بھری ہوئی کتابیں چھپیں، اکیڈمی کی گاڑیوں کا مِس یوز ہوا۔ ان پر جلی حروف میں بخط انگریزی گورنمنٹ آف دہلی تو لکھا گیا مگر اردو میں اردو اکیڈمی دہلی نہیں لکھا گیا کیونکہ اس سے شاید ان کاروں پر سواری کرنے والوں کا رعب کم ہونے کا اندیشہ تھا۔ انھوں نے گورننگ کونسل کے آخری جلسے کی کارروائی انگریزی میں تیار کروائی حالانکہ ہم سب لوگوں نے اردو میں اپنی بات رکھی تھی اور گورنر صاحب تک نے بہترین اردو میں کونسل کو خطاب کیا تھا۔ سب سے بڑا یہ ستم ہوا کہ اس جلسے میں سکریٹری کے عہدہ کے لئے محاسن اور شرائط کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا مگر زبیر رضوی نے اپنی طرف سے یہ فیصلہ بھی کونسل کے جلسے کی کارروائی میں شامل کر دیا۔ اس جلسے میں گورنر صاحب نے صاف صاف کہا تھا کہ اس جلسے کی غرض وغایت صرف آئین میں ترمیم کر کے لفٹیننٹ گورنر کی جگہ پر وزیر اعلیٰ کو اکیڈمی کا صدر مقرر کرنا اور ایگزیکیٹو ڈائرکٹر کے عہدہ کا نام سکریٹری کا عہدہ رکھنا ہے مگر شاید زبیر رضوی خود کو سب سے بلند سمجھتے ہیں اس لئے انھوں نے گورنر کی وضاحت کے باوجود اپنا حکم چلا دیا۔

بیسویں صدی نے اُردو کے مفاد میں، اردو اکیڈمی کو فعال بنانے کے لئے جو تحریری مہم چھیڑی ہے اُسے آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ انشاء اللہ میں آئندہ ماہ بالتفصیل اُردو اکیڈمی کی کارگذاریوں پر دستاویزی ثبوتوں کے ساتھ روشنی ڈالوں گا۔

پروانہ ردولوی
رُکن گورننگ کونسل،
دہلی اُردو اکیڈمی
165۔ حوض رانی۔ پی او باکس نمبر 4093۔ مالویہ نگر۔ نئی دہلی 110017
فون: 6215397 - 6212539

(بمبئی) سے خرید کر پڑھا۔ حسب سابقہ آپ نے بے حد محنت سے اُسے ترتیب دیا ہے اور نہایت ہی کہنہ مشق اُدبار و شعراء حضرات کو یکجا یعنی ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کر کے ثابت کر دیا ہے کہ "بیسویں صدی" اپنی دلکشی، اپنے معیار اور اپنے پُروقار ادب کو برقرار رکھے ہوئے ہے اس قدر عظیم ہستیوں کا تعاون شاید ہی کسی دوسرے ادبی ماہنامہ کو حاصل ہوگا اس کا سہرا آپ کے سر بندھتا ہے۔ میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔

آزاد گورداسپوری ——— بمبئی

● آج سعودی عرب سے واپس آیا تو نیوز ایجنٹ سے شہرۂ آفاق بیسویں صدی کا سالنامہ ملا۔ ادبی دستاویز دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ ماشاء اللہ آپ کا انتخاب قابلِ ستائش ہے ہر افسانہ شاہکار ہے۔ یقیناً دنیائے ادب کے قارئین کرام کو اس ادبی فن پارے پر ناز رہے گا اور بیسویں صدی ہمیشہ ہی اس کا مستحق رہا ہے۔ ماہنامہ بیسویں صدی، کا مایہ ناز ادبی سالنامہ پیش کرنے پر میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔ خداوند کریم اس ادبی فن پارے کو حاسدوں اور بد نظروں سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

گلزار احمد شاد ——— البحرین

● بیسویں صدی اپریل ۹۴ء سکندر آباد بک اسٹال پر جلد ہی مل گیا۔ بہت ہی معیاری تخلیقات ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس رسالے کو نظرِ بد سے بچائے۔ آمین۔ بھائی جان جذبہ سچا ہو تو کامیابی ضرور ملتی ہے۔ آپ سچی محنت کامل جستجو اور مشکل حالات کا ہمت سے مقابلہ کرتے ہوئے اردو کو اپنی ٹھنڈی رحمت و محبت کے سایے میں پناہ دیے ہوئے ہیں۔ مئی کے شمارے سے اس کی قیمت ۱۲ روپے رکھی گئی ہے اور یہ حالات کے لحاظ سے واجبی ہے۔ سالنامہ بھی نظر سے گذرا۔ اتنا خوبصورت، معیاری اور دلکش سالنامہ نکالنے پر دل کی عمیق گہرائیوں سے مبارکباد قبول فرمائیں۔

بلقیس کوثر ——— بھونگیر

●●

۱۹ر فروری ۱۹۹۵ء کو رفیع احمد قدوائی کے یوم پیدائش کے موقع پر مرکزی وزیر مواصلات مسٹر سکھ رام نے ان کی یاد میں ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔ یاد رہے کہ مرحوم ہندوستان کے پہلے وزیر مواصلات تھے۔ اس موقع پر وزیر مواصلات نے کہا کہ رفیع احمد قدوائی نے قومی زندگی میں جو رول ادا کیا اس کے لیے انھیں ساری قوم ہمیشہ یاد رکھے گی۔

۲۰ر فروری سے ۲۶ر فروری تک سات روزہ ادبی میلہ ساہتیہ اکادمی دلّی کے اہتمام میں شروع ہوا۔ ۲۱ر فروری کو ہندوستانی زبانوں کے ۲۲، ادیبوں کو ان کی تصنیفات کے لیے اعزاز سے نوازا گیا۔ ۲۲ر فروری کی صبح کو ادیبوں کی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا جس میں ادیبوں نے اپنی اعزاز یافتہ تخلیقات اور اپنے تجربات پر روشنی ڈالی۔ ہفتہ بھر جاری رہنے والی اس نمائش کا افتتاح معروف نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کیا۔ اس موقع پر پروفیسر نارنگ نے اکادمی کی کارکردگی اور اس کے پروگراموں کی ستائش کی۔ اکادمی کے سکریٹری شری اندرناتھ چودھری نے اس موقع پر اکادمی کی کارکردگی کی تفصیلات پیش کیں۔ ۲۱ر فروری کو منعقدہ ایک وقیع تقریب میں جن ۲۲ ادیبوں کو انعامات ۱۹۹۴ء دیے گئے ان میں جناب مظہر امام بھی شامل تھے۔

۲۲ر فروری کو ادیبوں کی کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں جناب مظہر امام نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ بات قابل اطمینان ہے کہ اردو زبان کے تئیں دلچسپی بڑھ رہی ہے۔ خاص طور سے بہار اور مہاراشٹر میں۔ تمل ناڈ، حیدرآباد اور کرناٹک سے اردو کے بہت سے نئے تخلیق کار سامنے آرہے ہیں، جن کی تخلیقات کا شمالی ہندوستان کی زبانوں کے علاوہ انگریزی، عربی اور روسی زبانوں میں ترجمہ ہو رہا ہے۔

۲۱ر فروری کی شام کو درگاہ شاہِ مرداں نئی دہلی میں امیر المؤمنین حضرت علی ابن ابی طالب کی شہادت کے سلسلے میں ایک مجلس عزا کا انعقاد ہوا جس میں جناب مولانا ممتاز علی نے خطاب فرمایا۔

۲۳ر فروری کو شیرِ خدا حضرت علیؓ کی یاد میں برہم پوری دہلی میں ایک اجتماع ہوا۔ جس میں سوزخوانی جناب سید خورشید اکبر نے کی جب کہ متعدد شعراء نے پیش خوانی کی۔ ڈاکٹر مولانا سید محبوب مہدی نے اجتماع سے خطاب کیا۔

۲۶ر فروری کو "توحید اور اس کے تقاضے" کے موضوع پر چھوٹی مسجد اہلِ حدیث، احاطہ کیدارہ، باڑہ ہندو راؤ دہلی میں خطبات کا اہتمام کیا گیا۔ مقررین میں حافظ شکیل احمد میرٹھی، مولانا عبدالرحیم فیض اور مفتی عبدالرحمٰن شامل تھے۔

۲۷ر فروری کو دہلی کی پھول نمائش میں جموں و کشمیر نے پہلا انعام حاصل کیا۔ ہند میں امریکہ کے سفیر نے ایک خوبصورت تقریب میں انعامات تقسیم کیے۔ پھول نمائش کا اہتمام ینگ وومینز کرسچین ایسوسی ایشن نے کیا تھا جس میں ہندوستان کی تمام ریاستوں اور نئی دہلی میں قائم مختلف سفارت خانوں نے شرکت کی۔ اس پھول نمائش میں حکومت جموں و کشمیر کی نمائندگی وہاں کے محکمۂ باغات نے کی تھی۔ یہ

آج کا دور ترقی یافتہ دور کہلاتا ہے مگر ہر جگہ، ہر خاندان اور ہر سوسائٹی میں باہمی ہمدردی، آپسی محبت و ملنساری، اور ہم آہنگی برائے نام ہی باقی ہے۔ الاماں الاماں! کس قدر بے مروتی اور خود غرضی کا دور دورہ ہے۔ اس طرح کسی کی یہ رائے بھی حقیقت آفریں ہے کہ "دورِ حاضر کی مشینی زندگی کی گویا ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ گھریلو زندگی کی ساری گرم جوشیاں سرد پڑ چکی ہیں اور شفقت و محبت کی حرارت رفتہ رفتہ ختم ہو کر اپنی جگہ پر ایک منجمد اور برف پوش سمندر چھوڑ گئی ہے زندگی بے رونق ہو گئی ہے اور خلوص و یک رنگی کی روح اس کو داغِ مفارقت دے چکی ہے"۔ اس پس منظر میں جب ہم ماں باپ کے ساتھ اولاد کے روابط پر غور کرتے ہیں تو بہت دکھ ہوتا ہے۔ والدین کی خدمت اور ان کا احترام مذہبی نقطۂ نظر سے بزرگ ترین عمل ہے مگر آج کی اولاد بے خبری کی زندگی بسر کر رہی ہے جس میں والدین کی بے توجہی اور نا فرض شناسی کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ والدین کے ساتھ نیکی اور بدی کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتا۔ والدین کے حقوق کیا ہیں کوئی نہیں بتاتا۔ اس طرح اُن کے فرائض پر بھی گفتگو نہیں کی جاتی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ بنیادی ضرورت ہر طرح پہلو تہی کا شکار ہے اور ہمارا معاشرہ بدترین معاشرہ بن گیا ہے۔

(ادارہ)

دہلی پھول نمائش اپنی نوعیت کی دیدہ زیب نمائش تھی جسے دیکھنے کے لیے بڑی تعداد میں شائقین آئے اور داد سے جذبات تحسین ادا کیے۔

۲۶ر فروری کو جامعۃ الثقلین، خریجی دہلی کے اہتمام میں ہر ماہ کی طرح اس ماہ بھی توسیعی خطبے کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے "تاریخ اور تہذیب" کے موضوع پر خطبہ دیا۔ انھوں نے اپنے خطبے میں کہا کہ تاریخ ماضی کی داستان نہیں مستقبل کے سفر میں مشعل راہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہم عصر تہذیب کی آئینہ دار بھی ہوتی ہے۔

اس جلسے کا آغاز جناب سجاد حسین کی قرائتِ کلام پاک سے ہوا۔ ابتدا میں سید شریف الحسن نقوی نے تعارفی تقریر کی جناب مولانا عقیل الغروی نے اپنی افتتاحی تقریر میں آثار قدیمہ اور میوزیموں کو انسان کے تہذیبی سماجی، معاشی اور مذہبی سفر کا منہ بولتا ہوا گواہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ ہر تہذیب کے ارتقا کے پس پردہ تاریخی حقائق کار فرما ہیں۔

۲ر مارچ کو انجمن ترقی اردو ہند کے صدر دفتر اردو گھر نئی دہلی میں ماہر اقبالیات ممنون حسن مرحوم کی رحلت پر جلسۂ تعزیت کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ پوری دنیا میں علامہ اقبال پر دیے جانے والے سب سے بڑے مدھیہ پردیش کے ایوارڈ "اقبال سمان" جاری کرانے میں ممنون حسن مرحوم کا خاص ہاتھ تھا۔ اس کے علاوہ اُن کی اور جناب عزیز قریشی کی کوششوں سے بھوپال میں "اقبال میدان" اور "اقبال مینار" بنائے گئے جن سے علامہ اقبال کے تئیں ممنون حسن خاں مرحوم کی گہری دلچسپی اور عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے کہا ممنون حسن مرحوم غالباً آخری انسان تھے جنھیں علامہ اقبال کو قریب سے دیکھنے اور اُن کی خدمت کرنے کا شرف حاصل تھا۔ اس جلسے میں ڈاکٹر اسلم پرویز، جناب حبیب خان اور محترمہ شمیم جہاں نے بھی مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور اُن کی ادبی خدمات کو سراہا۔

۳ر مارچ یعنی یکم شوال کو عید الفطر دہلی میں بھی بہت جوش و خروش کے ساتھ منائی گئی اور بلا تفریق مذہب و ملت لوگوں نے خوش دلی کے ساتھ ایک دوسرے کو عید کی مبارکباد پیش کی۔ دہلی میں نماز عید ادا کرنے والوں کے لیے خصوصی بسوں کا انتظام کیا گیا تھا عید گاہ، جامع مسجد، مسجد فتح پوری اور نئی دہلی کی جامع مسجد میں بے پناہ مجمع تھا۔ لاکھوں لوگوں نے مسرت و شادمانی کے جذبات کے ساتھ دوگانہ ادا کیا اور بارگاہ خداوندی میں جذباتِ تشکر پیش کرتے ہوئے عالم انسانیت کی فلاح و بہبود، اتحاد و اتفاق اور بقائے عالم کے لیے دعا کی اور پوری دنیا کے لوگوں کی ترقی، خوشحالی اور کامرانی کی تمنا کی۔ شام کو ۲۵۔ کوٹلیہ مارگ نئی دہلی میں عید ملن کی تقریب سالہائے گزشتہ کی طرح اس سال بھی ہمدرد کے واقف متولی جناب حکیم عبدالحمید کی قیادت میں منائی گئی جس میں ممتاز شہریوں نے شرکت کی اور ایک دوسرے کو عید کی مبارکباد پیش کی۔ راجدھانی کے علاوہ پورے ملک میں عید الفطر کے مبارک و مسعود موقع پر روایتی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا گیا۔ شاہی امام عبداللہ بخاری نے دہلی کی جامع مسجد میں اپنے خطبے میں امن و امان اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے دعا کی۔

۱۱ر مارچ کو ایوان غالب نئی دہلی میں انڈین کلچرل سوسائٹی کے اہتمام میں ہولی، عید ملن کے موقع پر نیز مشہور شاعر جناب نصرت گوالیاری کے جشن کے سلسلے میں کل ہند مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس موقع پر شری کے ایل نارنگ ساقی کی تخلیق "ادیبوں کے لطیفے" کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ یہ تقریب شعر و ادب جناب میکش امروہوی کی مساعی جمیلہ کی بدولت ظہور پذیر ہوئی۔

۱۲ر مارچ کو اتوار کے دن راجیہ سبھا کے رکن جناب سید سبط رضی کی رہائش گاہ، ۱۰ تین مورتی لین نئی دہلی میں بڑے انتظام و انصرام کے ساتھ "عید ملن" تقریب کا اہتمام کیا گیا اس تقریب میں جو کئی سال سے جاری ہے۔ سال گذشتہ کی طرح اس سال بھی وزیر اعظم شری پی وی نرسمہا راؤ نے اس عید ملن تقریب میں شرکت کی۔ وزیر اعظم کے علاوہ وزیر خزانہ شری من موہن سنگھ، شری راجیش پائیلٹ اور مسٹر جگدیش ٹائٹلر کے علاوہ شری کے۔ سی۔ پنت، شری وسنت ساٹھے، شری منی شنکر ایئر بھی اس تقریب میں موجود تھے۔ جہاں تک غیر ملکی سفارت کاروں کا تعلق ہے ان میں سوڈان، ایران، ازبکستان اور فلسطین کے سفارت کار کی شرکت قابل ذکر ہے۔ اس تقریب میں مختلف فرقوں کے مذہبی رہنماؤں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔ وزیر اعظم شری پی وی نرسمہا راؤ اس تقریب میں ۱۵ منٹ تک موجود رہے اور تمام لوگوں سے انھوں نے ملاقات کی اور عید کی مبارکباد دی۔ تقریب کے میزبان جناب سید سبط رضی نے

صغریٰ مہدی کی پہچان

گذشتہ دنوں پروفیسر صغرا مہدی کے افسانوں کا مجموعہ "پہچان"، کی تعارفی محفل کا انعقاد جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کانفرنس ہال میں ہوا۔ کتاب کی رسم اجرا محمد ولی بخش قادری کے دست مبارک سے ہوئی۔ اس موقع پر عہدۂ صدارت سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی نے کہا۔ "صغرا مہدی کی پہچان فکشن سے ضرور ہے لیکن انھوں نے سفرنامہ، سوانح اور تحقیق پر بھی مہارت سے لکھا ہے"۔ موصوف نے مزید کہا کہ صغرا مہدی کے افسانوں میں کوئی پوز نہیں ملتا۔ ان کی زبان عام اور سادہ ہوتی ہے"۔

اردو کی مشہور و معروف مصنفہ قرۃ العین حیدر نے بھی محفل سے خطاب کیا۔ انھوں نے کہا کہ "صغریٰ کے افسانوں میں لطیف ساطنز ملتا ہے"۔

اس موقع پر پروفیسر عظیم الشان صدیقی اور ڈاکٹر شمس الحق عثمانی نے "پہچان" کے مختلف افسانوں پر تبصرہ بھی کیا۔ ڈاکٹر خالد محمود نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ جب کہ ڈاکٹر شہپر رسول نے شکریہ کے کلمات ادا کئے۔ — رپورٹ اسلم جمشید پوری

اس موقع پر کہا کہ وزیراعظم شری پی وی نرسمہا راؤ کی قیادت نے ملک کو وقار عطا کیا ہے اور اس تقریب میں ان کی تشریف آوری ان کے جذبہ اخوت ومحبت کی آئینہ دار ہے۔

۱۵ رمارچ کو باڑہ ہندو راؤ ریذیڈنٹ ویلفیئر ایسوسی ایشن کی طرف سے عید ہولی ملن تقریب کا بڑے پیمانے پر اہتمام کیا گیا جس میں علاقے کے لوگوں نے بلا تفریق مذہب وملت پوری دلچسپی کے ساتھ شرکت کی۔ ۱۵ رمارچ کو ہی موتی کا گل جوبلی فاؤنڈیشن کے موقع پر اجمل خاں پارک قرول باغ نئی دہلی میں ہولی عید ملن تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں سرکردہ شخصیتوں نے شرکت کی اور اتحاد باہمی اور اخوت ومحبت کو فروغ دینے کے لئے زور دیا۔

۱۹ رمارچ کو حضرت امام خمینی کے فرزند الحاج سید احمد خمینی کی رحلت کے سلسلے میں خانہ فرہنگ جمہوریہ اسلامی ایران نئی دہلی میں اور شہر کے دوسرے علاقوں میں تعزیتی جلسے ہوئے خانہ فرہنگ کے اجتماع میں دہلی اور اطراف دہلی کے مسلمانوں نے ایک بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اس موقع پر تلاوت کلام پاک کے بعد نمائندہ ولی فقیہہ سید مرتضیٰ موسوی نے سوگواروں سے خطاب کیا۔ انھوں نے مرحوم سید احمد خمینی کی خدمات عالیہ کو خراج تحسین ادا کیا۔ اس جلسے کو خطاب کرنے والے دیگر مقررین میں مولانا سید محمد نقوی، مولانا سید محبوب مہدی اور ڈاکٹر سید اختر مہدی شامل تھے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ دو دن پہلے دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے سید احمد خمینی کا تہران کے ایک اسپتال میں انتقال ہو گیا تھا۔ مرحوم سید احمد خمینی اسلامی انقلاب کے ہر مرحلہ میں اپنے والد کے ہمراہ تھے۔

۱۹ رمارچ کو سید احمد خمینی کے انتقال پر جامعۃ الثقلین خریجی دہلی میں تعزیتی جلسے کا انعقاد عمل میں آیا جس میں ٹرسٹ کے چیرمین سید شریف الحسن نقوی اور سفارت خانہ ایران کے کلچرل کونسلر نے حاضرین سے خطاب کیا اور مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔

۱۹ رمارچ کو نئی دہلی میں ہند۔ ازبکستان دوستی سوسائٹی کی طرف سے دونوں ملکوں کے سفارتی تعلقات کی تیسری سالگرہ سے متعلق تقریب ہوئی۔ اس موقع پر ہند میں ازبکستان کے سفیر جناب میرقاسموف نے کہا کہ ہندوستانی عوام نے ازبک عوام کے دلوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ محبت اور ثقافت کے ذریعہ قائم دوستی کے اس تعلق کو فروغ دینے کے لئے ضروری ہے کہ دونوں ملک تحقیق واشاعت کے میدان میں ایک دوسرے کی تہذیب وثقافت اور ادب کی تشہیر کریں۔ اس تقریب میں پروفیسر قمر رئیس کی کتاب "علی شیر نوائی اور ازبکستان" کی رسم اجراء انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز کے صدر جناب وسنت ساٹھے نے کی۔ اس کتاب کے تعلق سے جناب میرقاسموف نے کہا کہ اس کتاب کو کئی زبانوں میں شائع کر دیا جائے گا۔ پروفیسر رشید الدین خاں نے علی شیر نوائی پر کتاب لکھنے کے لئے پروفیسر قمر رئیس کو مبارکباد دی اور ازبک ادب پر تفصیل سے گفتگو کی۔ صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالحق نے اپنی تقریر میں کہا کہ ازبکستان کے عالموں نے عربی ریاضیات اور فلکیات کو کافی فروغ دیا ہے۔ مسز شیلا گجرال نے اپنے قیام ازبکستان کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ وہاں کے لوگ اس قدر خوش مزاج اور روشن خیال ہیں کہ ان میں اجنبیت کا نشان بھی محسوس نہیں ہوتا۔ انھوں نے دونوں ملکوں کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کے درمیان تبادلہ خیالات کی ضرورت پر زور دیا۔ اس تقریب کی نظامت پروفیسر قمر رئیس نے کی۔

مسقط میں یادگار مشاعرہ اور لکچر

● سلطنت عمان اور ہندوستان کے تعلقات صدیوں پرانے ہیں۔ آج بھی تارکین وطن میں یہاں سب سے بڑی تعداد ہندوستانیوں کی ہے۔ عمان کے دارالحکومت مسقط کے بازاروں میں اردو عام زبان کے طور پر بولی جاتی ہے۔ بہت سے عرب بھی اردو روانی سے بولتے ہیں۔ عربی کے بعد اردو یہاں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ یہاں جو ادبی تنظیمیں مشاعرے اور ثقافتی پروگرام کرتی رہتی ہیں ان میں ہمایوں ظفر زیدی کی مساعی کو بہت دخل ہے۔ وہ مسقط کی ہردل عزیز شخصیت ہیں اور یہاں انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ حال ہی میں مسقط میں اردو تقاریب کا اہتمام انھوں نے فندق مجان کے تعاون سے کیا۔ مشاعرہ سے ایک دن پہلے ہندوستان سے آئے ہوئے ممتاز نقاد اور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے "جدید اردو شاعری کا بدلتا منظر نامہ" کے موضوع پر توسیعی لکچر دیا جسے بہت سراہا گیا۔ دوسرے دن مشاعرے کی صدارت بھی ڈاکٹر نارنگ نے فرمائی۔ سفیر پاکستان سلطان حیات خان مہمان خصوصی تھے۔ مقبول علی سلمان، حسن علی سلمان فرسٹ سکریٹری سفارت خانہ ہند اور تمام عمائدین شہر اور صاحبان ذوق نے شرکت فرمائی۔ ڈاکٹر نارنگ نے بڑے خوبصورت انداز میں اردو زبان وادب پر روشنی ڈالی۔ ہمایوں ظفر زیدی نے کہا کہ یہ اردو کا اعجاز ہے کہ وہ ہم سب کو ایک جگہ پر لے آتی ہے۔ ہندوستان سے جوگا سنگھ انور، منظر بھوپالی اور ہلال سیوہاروی نے شرکت کی اور پاکستان کی نمائندگی مظفر وارثی، فرخ گیلانی اور حسن رضوی نے فرمائی۔

(رپورٹ شکیل کاظمی)

گذارش

جواب طلب امور کے لیے مناسب ڈاک ٹکٹ کا پتہ لکھا لفافہ ارسال کریں۔
مسودات کاغذ کے ایک طرف، خوشخط فل اسکیپ کاغذ پر ارسال کریں۔ (ادارہ)

(بیسویں قسط)

تیری سرکار میں پہنچے

دلیپ سنگھ
59/4، راجندر نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۰

۱۹۸۰ء کے آخر میں مجھے اسٹریا کی راجدھانی وی آنا میں ٹرانسفر کر دیا گیا۔

ہوا یوں کہ فارن سروس میں ملازمت کرنے کے باوجود میں کئی سال سے دلّی میں ٹکا ہوا تھا۔ اس کی کچھ ذاتی وجہیں تھیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اگر میں دلّی سے چلا گیا تو اُردو میں لکھنا لکھانا ممکن نہیں رہے گا کہ میں زیادہ تر ریڈیو کے پروگراموں کے لیے لکھتا تھا اور ایسا کرنا دلّی سے باہر رہ کر ممکن نہیں۔ اس عرصے میں سرکار مجھے دنیا کے مختلف ممالک میں تعینات کرتی رہی جن میں روس، ڈنمارک اور ہالینڈ بھی شامل تھے، لیکن میں تھوڑی سی کوشش کے بعد سرکار کے یہ حکم نامے منسوخ کرا لیتا تھا کہ ان ملکوں میں جانے کے لیے میرے بہت سے ساتھی ہر وقت تیار ملتے تھے لیکن ایک بار میرا تقرر کولمبو میں ہو گیا۔ وجہ سرکار نے یہ دی کہ چونکہ یہ شخص کہتا ہے کہ دلّی میں اُس کے بہت سے کام توجہ طلب ہیں اس لیے اس کا کسی پڑوسی ملک میں تقرر اس کے لیے مفید رہے گا۔ میرے حق میں کیے گئے فیصلے کے پس منظر میں دراصل مجھے سزا دینا مطلوب تھا۔ سرکار نے سوچا کہ اس شخص نے ہمیں بے حد پریشان کر رکھا ہے۔ اسے ایسی جگہ بھیجو جہاں اسے نانی یاد آ جائے۔

نانی مجھے سرکاری حکم نامہ دیکھ کر تو یاد نہ آئی، لیکن اُس وقت یقیناً یاد آئی جب میں نے یہ حکم نامہ منسوخ کرانے کی کوشش کی۔ میری کوئی سنتا ہی نہیں تھا کیونکہ کولمبو کی پوسٹنگ کو سود مند نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ایک تو اس لیے کہ وہاں تنخواہ یورپین ملکوں کے مقابلے میں کم تھی اور دوسرے یہ کہ وہاں کے مقامات اور لوگ ویسے ہی تھے جیسے ہم ہر روز یہاں دیکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں جب میں پوسٹنگ بورڈ کے چیئرمین کے سامنے پیش ہوا تو انھوں نے طنزاً کہا کہ "آپ تو امریکہ کے علاوہ کہیں جانا ہی نہیں چاہتے۔" جلدی میں مجھے اُن کے جملے کا کوئی مناسب جواب نہ سوجھا تو میں نے کہا کہ امریکہ کون کم بخت جانا چاہتا ہے۔ میں اس سے کہیں زیادہ خوبصورت ملک میں جانا چاہتا ہوں۔"

"مثلاً؟" چیئرمین نے پوچھا۔

میں نے جلدی جلدی اُن شہروں کے بارے میں سوچنا شروع کیا جہاں کوئی فوری ویکنسی نہیں تھی تاکہ معاملہ اپنے آپ دب جائے۔ چنانچہ میں نے کہا۔

"مثلاً وی آنا۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ بولے۔

پتہ نہیں یہ کیسے ہوا کہ چند ہی دنوں میں مجھے وی آنا جانے کے آرڈرز مل گئے۔ وہاں کوئی صاحب کسی بہانے کی بنا پر اپنی تقرری کی مدّت بڑھاتے چلے جا رہے تھے۔ سرکار نے اُسے واپس بُلانے کے لیے حکم نامہ میرے نام جاری کر دیا۔

وی آنا پہنچا تو اس کے حسن کو دیکھ کر اتنا متاثر ہوا کہ بہت دیر تک کفِ افسوس ملتا رہا کہ میں کئی سال پہلے یہاں کیوں نہ آ گیا۔ اتنا خوبصورت شہر اور اتنے خوبصورت لوگ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ خوبصورت لوگ اور خوبصورت مقامات تو اپنے ملک میں بھی بہت ہیں، لیکن انھیں چراغ لے کر ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ وی آنا میں صورت حال یہ تھی کہ کھڑکی کے باہر جھانکو تو سامنے حسن ہی حسن نظر آئے گا۔ تقریباً ویسی ہی حالت تھی جیسی اُردو کے اس شاعر کی تھی جو ذرا سی گردن جھکا کر اپنے محبوب کی تصویر دیکھ لیتا تھا۔

سارے شہر میں کوئی جگہ اگر مجھے اچھی نہ لگی تو وہ ہمارا دفتر تھا۔ دفتر ایسا تو نہیں تھا جیسے دفتر دلّی میں ہوتے ہیں کہ ان کی سیڑھیوں میں پان کی پیک کی مدد سے بنائے گئے ماڈرن پینٹنگز کے نمونے ملتے ہیں اور فائلوں کے ڈھیروں پر گرد اس طرح جمی ہوتی ہے کہ آتا جاتا اُن پر انگلی سے نہ صرف اپنا نام لکھ لیتا ہے بلکہ اگر چاہے تو اپنی تصویر بھی بنا سکتا ہے۔ وی آنا میں ہمارے دفتر کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اُسے صاف رکھنے کی ذمّے داری ماریا نام کی ایک عورت کے سپرد تھی جو ہمارے اعتراضات کے باوجود دفتر اس طرح چمکا کر رکھتی تھی کہ اُسے خراب کرتے ہوئے ہمیں شرم آتی تھی۔ شکایت میری یہ تھی کہ دفتر اتنا بڑا نہیں تھا جتنا اسٹاف کے حساب سے اُسے ہونا چاہیے تھا۔ اس بلڈنگ میں ہم سب کا ڈھنگ سے بیٹھنا اور کام کرنا ممکن نہیں تھا۔ خود مجھے جو کمرہ دیا گیا وہ یقیناً کسی زمانے میں غسل خانہ رہا ہو گا کہ نہ صرف اس کا سائز اتنا تھا بلکہ صابن رکھنے اور تولیہ ٹانگنے کے لیے جگہ بھی بنی ہوئی تھی۔ پبلسٹی کے علاوہ چونکہ دفتر کی انتظامیہ کی ذمّے داری بھی میری تحویل میں تھی۔ اس لیے وہاں پہنچتے ہی مجھے حکم ہوا کہ ہندوستانی سفارت خانے

کے لیے کوئی نئی بلڈنگ خریدوں۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ وی آنا کی جس بلڈنگ میں آج کل ہندوستانی سفارت خانہ ہے میری خریدی ہوئی ہے۔ اس کارگزاری سے خوش ہو کر سفیر محترم نے اپنے لیے بہترین کمرے کا انتخاب کرنے کے بعد دوسرا بہترین کمرہ مجھے الاٹ کر دیا یہاں کام کرتے ہوئے مجھے وی آنا کے اوپرا ہاؤس کی شاندار بلڈنگ نظر آتی تھی۔ سفیر تو مذاق میں یہ بھی کہا کرتے تھے کہ دفتر کی لائبریری میں تمہاری ایک بڑی سی تصویر بھی لگوائیں گے، لیکن بعد میں محض اس لیے یہ ارادہ ترک کر دیا گیا کہ گیانی ذیل سنگھ جی راشٹرپتی بن گئے اور ان کی تصویر کو وہاں لٹکانا ضروری ہو گیا۔ سفیر محترم کہتے تھے کہ اگر تمہاری تصویر گیانی جی کی تصویر کے ساتھ لٹکا دی تو لوگ پوچھا کریں گے کہ ان تصویروں میں اصلی گیانی جی کون ہیں۔

وی آنا میں سفارت خانے تو تھے ہی کہ ہر ملک کے دارالخلافے میں ہوتے ہیں لیکن وہاں دولت متحدہ کے کئی دفتر ہونے کی وجہ سے ڈپلومیٹک کمیونٹی خاصی بڑی تھی۔ اس کمیونٹی کی سہولیت کے لیے اسٹرین سرکار نے وہاں باقاعدہ ایک محکمہ بنا رکھا تھا جس کا کام سفارتی عملے کو سہولتیں بہم پہنچانا تھا۔ اس دفتر کے لوگ وی آنا میں داخل ہونے والے ہر نئے سفارت کار کو خود جا کر ملتے تھے اور اسے وی آنا کے بارے میں معلومات بہم پہنچانے کے لیے بہت سا لٹریچر دے جاتے تھے۔ لٹریچر دے جانے کے بعد وہ ہمیں بھول نہیں جاتے تھے ان کا دفتر تو چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا۔ گھر میں کوئی بے وقت بیمار ہو جائے یا آدھی رات کو آپ کی کار کسی حادثے کا شکار ہو جائے تو انھیں فون کیجئے وہ مناسب ہدایات دیتے تھے کہ اس وقت فلاں ڈاکٹر کا مطب کھلا ہے اور فلاں ورکشاپ اس وقت آپ کی کار مرمت کر دے گی۔ ان کا کہنا تھا کہ انھیں فون کیجئے یا خود جا کر ملئے، وہ آپ کی ہر مشکل کا حل ڈھونڈ دیں گے۔

یہ دفتر کتنا فعّال تھا اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میرے وہاں پہنچنے کے کچھ عرصے بعد مجھے ان کے ہاں سے ایک سیمینار کا دعوت نامہ ملا۔ سیمینار کا موضوع یہ تھا کہ اگر آپ خدانخواستہ وی آنا کی پوسٹنگ کے دوران مر جائیں تو آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔

ہمیں تو بچپن سے ہی سکھایا گیا ہے کہ موت برحق ہے اور کسی وقت اور کسی جگہ بھی آ سکتی ہے۔ اس لیے میں نے اس دعوت نامے کا بغور مطالعہ کیا۔

پہلا جملہ یوں تھا "ہمیں اس سے انکار نہیں کہ وی آنا میں مرنے میں آپ کو کچھ پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔" یہ جملہ کچھ اس طرح لکھا گیا تھا جیسے منتظمین یہ سمجھتے ہوں کہ کسی اور جگہ مرنے میں فائدے ہی فائدے اور آسانیاں ہی آسانیاں ہوں۔ اگلا جملہ یوں تھا "چونکہ عام طور پر لوگ موت کے ذکر سے گھبرانے لگتے ہیں اور اس کے اچانک آ جانے کے بعد پچھتانے لگتے ہیں۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس 'زمین دوز' مسئلے پر کھل کر گفتگو کی جائے۔" دعوت نامے میں 'زمین دوز' جیسی ترکیب کا استعمال مجھے بہت معنی خیز لگا۔

میں سیمینار میں وقت مقررہ پر پہنچ گیا۔

سب سے پہلے نیشنل بینک کے ایک بڑے افسر نے تقریر کی جس میں خصوصی بات اس نے یہ کہی کہ آپ کی موت کے بعد آپ کا روپیہ جو بینک میں جمع ہوگا وہ صرف اسی کو ملے گا جس کے نام آپ وصیت کر جائیں گے۔ ورنہ وہ روپیہ سرکار کی تحویل میں چلا جائے گا۔ میں نے اس کی بات کو اس لیے سنی ان سنی کر دیا کہ نہ صرف بینک میں تب تک میرا کچھ جمع نہیں تھا بلکہ میری جیب بھی خالی تھی۔ چنانچہ جب بینک کے اس افسر نے اپنے ایک وکیل دوست سے حاضرین کا تعارف کرایا کہ یہ وصیت لکھنے کے ماہر ہیں، تو میں نے ان کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

لیکن اس کے بعد آنے والے مقرر کو میں نظرانداز نہ کر سکا۔ وہ امیگریشن کا ایک افسر تھا۔ اس نے کہا کہ "وی آنا میں رہنے کا ویزا آپ کو محض اس لیے دیا گیا ہے کہ آپ کی سرکار نے آپ کو یہاں تعینات کر دیا ہے۔ آپ کے خاندان کے دوسرے افراد کو محض اس لیے ویزا دے دیا گیا ہے کہ وہ آپ کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ یاد رہے کہ اگر آپ اگلے سفر پر نکل گئے تو آپ کے خاندان کے افراد کو بھی جانا ہوگا۔ اس کا اندازِ تقریر بالکل ویسا تھا جیسا عام طور پر پولیس والوں کا ہوتا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا "شکر ہے اس نے صرف یہ کہا ہے کہ آپ کے خاندان کے افراد کو جانا پڑے گا۔ اگر وہ یہ کہہ دیتا کہ آپ کے خاندان کے افراد کو آپ کے ساتھ ہی جانا ہوگا تو میں اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔

سیمینار خطرناک صورت اس وقت اختیار کر گیا جب کفن دفن کی ایک فرم کے نمائندے نے اپنی تقریر شروع کی۔ اس نے کہا "حضرات یہ یاد رکھئے گا کہ آخری سفر کوئی آسان سفر نہیں ہے۔ آپ کتنا بھی دوڑیں، کتنی بھی تیزی دکھائیں، اس سفر میں وقت تو لگے گا ہی۔ ایک ہفتے تک تو قبرستان کا انتظامیہ آپ سے ملاقات ہی نہیں کرے گا کہ وہ بہت مصروف لوگ ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے لیے کفن سلوانا، قبر کھدوانا اور دیگر معاملات حل کرنے میں بھی خاصا وقت لے گا۔ ہاں البتہ اگر ایک ہزار ڈالر زیادہ خرچ کرنے کو تیار ہوں تو ہم لوگ آپ کا کام ایک ہفتے میں کروا دیں گے۔" اس کے بعد اس نے کفن دفن کے تفصیلی اخراجات سے ہمیں باخبر کیا۔ "قبرستان میں آپ کی پسندیدہ جگہ کا ریزرویشن، نعش کے لیے آرام دہ گاڑی اور عمدہ کفن پر کم از کم تین ہزار ڈالر خرچ ہوں گے۔" اتنا کہنے کے بعد اس کی نگاہ اچانک مجھ پر پڑی تو وہ کہنے لگا۔ "یہ مت سمجھئے گا کہ ہم صرف دفن کا انتظام کرنے ہی کے ماہر ہیں۔ ہمارے ہاں لاش کو جلانے کا بھی مناسب انتظام ہے اور اتنا اعلیٰ انتظام ہے کہ آپ کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ کب آپ کی لاش بھسم ہو گئی۔ اس مختصر سے عرصے میں آپ ہی کے مذہب کا ایک شخص مناسب منتروں کا اچارن کرتا رہے گا۔ بھسم ہو جانے کے بعد ایک خصوصی مشین کے ذریعے آپ کی ہڈیاں علیحدہ ہو کر ایک پوٹلی میں بندھ جائیں گی۔" اس کی آخری بات کو میں نے بہت غور سے سنا۔ دل میں لالچ بھی آیا کہ اگر یہاں انتم سنسکار ہو سکے تو کتنا مزا آئے گا لیکن جب گھر واپس لوٹ کر میں نے پوری بات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا تو یہی فیصلہ کیا کہ اس ملک میں مرنے کی بجائے زندہ رہنے میں زیادہ فائدہ ہے۔ (جاری)

بیسویں صدی نئی دہلی مئی ۱۹۹۵ء

انگلیاں فگار اپنی

یُوسف ناظم

۱۹ ۔ 'الہلال' ۔ ۱۳ ۔ باندرہ ری کلیمیشن ۔ بمبئی ۔ ۴۰۰۰۵۰

قدرت کو شاید پانچ کا ہندسہ بہت پسند ہے۔ اس نے آدمی کے ہاتھ کو پانچ انگلیوں سے آراستہ کیا ہے (پاؤں کے ساتھ بھی مساویانہ سلوک روا رکھا ہے) خود آدمی کو بھی پانچ ہی حواس دیے ہیں اسی لیے شاید وہ اکثر حواس باختہ ہو جاتا ہے۔ یہ حواس سننے، دیکھنے، سونگھنے محسوس کرنے اور چکھنے کے کام میں استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ اب یہ آدمی کی چھٹی حس پر منحصر ہے کہ وہ ان حواسِ خمسہ میں سے کسے زیادہ زحمت دیتا ہے۔ بعض لوگ دیکھتے کم ہیں۔ آنکھیں ان کی بند تو نہیں ہوتیں، لیکن یا تو انھیں کچھ نظر ہی نہیں آتا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے یا پھر ہر چیز ہری ہری نظر آتی ہے۔ کچھ لوگ سننے سے پرہیز کرتے ہیں بس اپنی کہے جاتے ہیں۔ لوگوں کو عدالتوں سے بھی یہی شکایت ہے وہاں کسی کی سنوائی ہی نہیں ہوتی حالانکہ عدالتوں کی دیواروں کے جام دیواروں کی طرح کان ہوتے ہیں۔ سونگھنے کی حس تو سبھی کی جاتی رہی ہے۔ جگہ جگہ کچرے کے ڈھیر موجود ہیں جن کی خوشبو سے فضا معطر رہتی ہے یا ہر جگہ سے دھواں نکلتا رہتا ہے۔ محسوس کرنے کی صلاحیت کا بھی یہی مزاج ہو گیا ہے پہلے ہم قصّے کہانیوں میں سنتے تھے کہ کسی آسیب زدہ جگہ سے گزرتے ہوئے آدمی اگر پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا تو پتھر کا بت بن جاتا تھا۔ اب آدمی کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ وہ خود پتھر کا بُت بن گیا ہے کسی خاص جگہ سے گزرے اور پیچھے مڑ کر دیکھے تو شاید آدمی بن جائے۔ (ماضی کی طرف ہی ایک مرتبہ مڑ کر دیکھ لے۔) اس کے حواسِ خمسہ میں ذائقے کی حس البتہ بہت تیز اور کارآمد ہو گئی ہے۔ کون سا ذائقہ ہے جو اس نے نہیں چکھا۔ زندگی میں موت کا ذائقہ تو چکھنے (اور چکھانے) میں بھی اُسے کمال حاصل ہے۔

حواسِ خمسہ کی طرح اس کے ہاتھوں کی پانچوں انگلیوں کے بھی اعمال و افعال الگ الگ ہیں۔ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں انگوٹھے کو انگلی کیوں کہا جاتا ہے۔ یہ واحد اعتراض ہے جو بالکل صحیح ہے۔ انگوٹھا ہر لحاظ سے الگ چیز ہے اسی لیے اسے انگلیوں سے دور ہی رکھا گیا ہے۔ چار انگلیوں کے مجموعے کو اگر ہم ہندوستان سمجھیں تو یہ انگوٹھا سری لنکا نظر آتا ہے۔ اُس کی شکل بھی کولمبو کی طرح ہے۔ انگلیوں کی ساخت میں قدرت نے جمالیات کا پہلو پیشِ نظر رکھا ہے اور بعض انگلیاں تو اتنی خوبصورت ہوتی ہیں کہ انھیں مخروطی کہا جاتا ہے۔ مخروطی انگلیاں عام طور پر نسوانی ہاتھوں میں ہوتی ہیں اور وہیں زیب بھی دیتی ہیں اور کتنے ہی لوگوں کا دل چاہتا ہے کہ کاش ان انگلیوں میں سے ایک انگلی میں وہ ایک انگوٹھی پہنا سکتے لیکن ایسی نازیبا اور غیر مہذب خواہشیں تو آدمی یعنی مردوں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ذکر تھا انگلیوں کی ساخت کا اور ان پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ قدرت نے انھیں انسان کے دوسرے اعضائے جسمانی کے مقابلے میں زیادہ توجہ سے بنایا ہے اور ان کی خوبصورتی میں اضافے کی خاطر ان پر ناخن بھی چسپاں کیے ہیں جن میں سے چند ناخن ہوش کے ناخن بھی ہیں اور جب ہم انگوٹھے کو بنظرِ غائر دیکھتے ہیں تو شبہ ہوتا ہے کہ قدرت کی توجہ یا تو ہٹ گئی تھی یا بٹ گئی تھی۔ ایک تو یہ کہ ہوتا ہی ٹیڑھا ہے۔ آدمی کے مزاج کی طرح۔ اسے موڑو تو دو ہی حصّوں میں ختم ہو جاتا ہے جب کہ مختصر ترین انگلی جسے ہم چھنگلی کہتے ہیں مڑتی ہے تو اس کے تینوں حصّے نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ انگوٹھا ہی ہے جو اندرونی سمت میں تین اور بیرونی سمت میں دو نیم نظر آتا ہے۔ اس کی انہی حرکتوں کی وجہ سے اسے انگلیوں کی قربت سے محروم رکھا گیا ہے لیکن چونکہ یہ بہرحال انسانی ہاتھ کا ایک اہم جزو ہے اس لیے جب بھی ہاتھ کا عکس کاغذ پر لیا جاتا ہے تو اسے بھی ساتھ رکھا جاتا ہے۔ آدمی کی انگلیوں کے نشانات کی اہمیت کیا ہے۔ یہ سب لوگ جلنتے ہیں۔ اس بارے میں جن لوگوں کا علم زیادہ ہے وہ جب بھی کوئی اہم کارنامہ انجام دیتے ہیں دستانے ضرور پہن لیتے ہیں۔ سوتے بھی ہیں تو دستانے پہن کر سوتے ہیں۔ ڈرتے ہیں کہ سوتے میں کہیں اُن کی انگلیوں کے نشان کسی جگہ نہ رہ جائیں۔ قدرت نے یہ عجیب و غریب انتظام کر رکھا ہے کہ ہزاروں لاکھوں آدمی ہم خیال ہو سکتے ہیں۔ ہم پیالہ ہم نوالہ اور ہم قبالہ ہو سکتے ہیں لیکن انگلیوں کے معاملے میں کوئی دو آدمی ہم نشان نہیں ہو سکتے۔ آدمی کے نقشِ قدم کی بھی اہمیت ہے لیکن کسی دوسرے شعبۂ حیات میں۔ ان میں وہ بات نہیں ہوتی جو ہاتھ کے عکس میں ہوتی ہے۔ یہ فرق صرف انگلیوں کے نشانات کی وجہ سے ہے۔ التجا ہو دعا ہو یا سوال آدمی ان کاموں کے لیے ہاتھ ہی استعمال کرتا ہے۔ ویسے کوئی نہیں بتا سکتا کہ آدمی کے ہاتھ کی انگلیوں کو یہ وقار اور مرتبہ کس صدی میں حاصل ہوا۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کے کارکنوں سے پوچھنا چاہیے کہ آیا انھوں نے اس موضوع پر کوئی تحقیقی کتاب

لکھی یاد رکھی ہے۔

مشہور مقولہ ہے کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ ہر انگلی ایک اکائی کی حیثیت رکھتی ہے اور ہر انگلی کا کاروبار دوسری انگلی کے کاروبار سے الگ ہے۔ پہلی انگلی کو جو انگوٹھے کے پڑوس میں نصب ہے سب سے بڑا ہونا چاہیئے تھا لیکن یہ اعزاز بیچ کی انگلی کو دیا گیا ہے۔ ویسے آدمی ہر کام میں پہلی انگلی ہی کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرتا ہے۔ اب تو چمچے زیادہ استعمال ہونے لگے ہیں ورنہ پرانا آدمی گھی بھی نکالتا تھا تو پہلی انگلی ہی کو ٹیڑھی کر کے نکالتا تھا۔ اب صرف محاورہ جوں کا توں رہ گیا ہے گھی کی نوعیت اتنی بدل گئی ہے کہ اگر واقعی گھی کھایا جائے تو آدمی کا ہاضمہ بگڑ جائے۔ اصلی گھی اب صرف وہی لوگ کھاتے ہیں جن کی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ یہ انگلی جسے انگشتِ شہادت بھی کہا جاتا ہے۔ کرکٹ کے کھیل میں بہت استعمال ہوتی ہے اور جب بھی امپائر یہ انگلی ہوا میں لہراتا ہے ایک کھلاڑی ضرور جام شہادت نوش کرتا ہے۔ مشہور تو یہ بھی ہے کہ کرکٹ کے امپائروں کے انتخاب میں ان کی انگلی کی ساخت اور زاویے کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ ٹریفک کانسٹبل بھی اسی انگلی کو حرکت دیتے ہیں اور بچے بھی اپنے والد کی یہی انگلی پکڑ کر جوان ہوتے ہیں۔ کوئی راہرو راستہ پوچھتا ہے تو اسے بھی اسی انگلی کی مدد سے غلط راستے پر لگایا جاتا ہے۔ بہت دور جانے کے بعد اسے کوئی ایسا آدمی ملتا ہے جو راستہ بتاتا، لیکن اب دیر ہو چکی ہوتی ہے اور وہ اتنا تھک چکا ہوتا ہے کہ پچھتانے کی بھی سکت اس میں نہیں رہتی۔ دنیا کی نصف آبادی کی زندگی اسی ڈھب سے گزرتی ہے۔ آسمان پر چاند بھی دیکھنا ہو تو دوسرا شخص آپ کو اسی انگلی کی مدد سے چاند کا محل وقوع بتاتا ہے۔

بیچ کی انگلی عام طور پر چھپانے کے کام آتی ہے۔ بڑی عمر کے بچے یا خود ماں باپ اپنے ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کو گلدستے کی شکل میں تبدیل کر کے چھوٹے بچوں سے کہتے ہیں۔ بیچ کی انگلی پہچانو اور بچہ انگلیوں کی اس شناخت پریڈ میں ہمیشہ غلط انگلی پر ہاتھ ڈالتا ہے اور والدین اس کے اس عمل سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ بعض والدین تو اپنی بیچ کی انگلی بالکل ہی چھپا دیتے ہیں اور بچہ انگلیوں کو گنے بغیر اس کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہی بچہ آگے چل کر رہنمائے قوم بنتا ہے کس منصوبے میں کیا کمی ہے اُسے پتہ ہی نہیں چلتا۔ کچھ لوگ بیچ کی انگلی میں شادی کی انگوٹھی بھی پہن لیتے ہیں لیکن اس انگوٹھی کے لیے تیسری انگلی کو بہتر مانا گیا ہے۔ اصل میں آدمی اپنی پہلی اور بیچ کی انگلی پر زیادہ فریفتہ ہے ناک کھجانی ہو یا عینک کو اپنے صحیح مقام پر واپس پہنچانا ہو تو پہلی انگلی ہی کو زحمت سخن دی جاتی ہے اور ایک نوبت یہ آتی ہے کہ آدمی عینک کی ان چہلوں سے عاجز آ کر آنکھ کے اندر ہی شیشے داخل کروا لیتا ہے نہ رہے عینک نہ تھکے انگلی۔ پہلی انگلی کے اشغال اور بھی ہیں۔ روشنی کا سوئچ بروئے کار لانا ہو تب بھی پہلی انگلی ہی اُٹھتی ہے۔ انگشت نمائی کی مبارک تقریب میں بھی یہی انگلی منظر عام پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ اکثر مقالہ نگار جو بہت احتیاط سے اپنا مقالہ کسی سمینار میں پڑھتے ہیں تو کاغذ پر پہلی انگلی ہی کو حرکت میں لاتے ہیں۔ اس ترکیب سے مقالہ سنایا جائے تو پڑھنے میں کوئی سطر (اور نہ کوئی کسر) رہ جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دو چار سطریں چھوٹ بھی جائیں تو مقالے کی سطح برقرار رہتی ہے یعنی اس کی سطحیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس انگلی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاتا ہے کہ جب کسی کی دکھتی رگ پر انگلی رکھنی ہوتی ہے تو یہی انگلی سب سے مفید اور کارگر ثابت ہوتی ہے۔ علم نجوم میں بھی پہلی انگلی کو بہت مانا جاتا ہے۔ اس انگلی میں انگوٹھی یا چاندی کا چھلا بھی ایطائے جلی کی طرح کی غلطی ہے۔ انگوٹھی کے لیے چھنگلی ہی سب سے اچھی انگلی ہے۔ اس میں رقم بھی کم خرچ ہوتی ہے۔ کانوں میں انگلیاں دیتے وقت اسے استعمال نہیں کیا جاتا، لیکن کان کے دوسرے برے وقتوں میں یہی انگلی کام دیتی ہے۔ چھنگلی کے کوئی خاص فرائض منصبی نہیں ہیں لیکن اس کے بغیر ہاتھ کے مکمّل ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ چھنگلی اصل میں ٹیم ورک کے لیے بنائی گئی ہے۔ شادی کے موقع پر دلہنوں کی چھنگلی ہی کو مرغوب سمجھا جاتا ہے۔ زندگی کے سب سے اہم واقعے میں ہاتھ کی سب سے کمزور انگلی کا عمل دخل بھی اس بات کی طرف کھلا اشارہ ہے کہ کسی بھی کمزور کو کہیں بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ سیاست دانوں سے غلطی یہی ہوتی ہے۔ خاموش طبع عوام کو انقلاب وغیرہ کی طرف متوجہ کرنے میں یہی غلطی محرک رہی ہے۔ سیاست داں بذاتِ خود ایسا کوئی انقلاب نہیں لاتے جس میں خود ان کے علاوہ کسی اور کا فائدہ ہو۔

ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کو جن میں انگوٹھا بھی شامل ہے اگر یکمشت استعمال کیا جائے تو اس اتحاد کے فائدے بے شمار ہوتے ہیں اور ہاتھ کے استعمال میں اگر 'صفائی' کا خیال رکھا جائے تو ملک کی پوری آبادی انگلیوں کے اشارے پر ناچنے لگتی ہے۔ دنیا میں یہی قاعدہ رائج ہے۔ بعض ملک البتہ ایسے ہوتے ہیں جہاں سرکار چند مخصوص لوگوں کی انگلیوں کے اشارے پر محو رقص ہوتی ہے لیکن یہ رقص درپردہ ہوتا ہے، کہیں کہیں یہ بھی ہوتا ہے کہ ہاتھ کی انگلیوں کا مجموعہ' یہ منع ہے وہ منع ہے۔ یہاں رُکیے، آگے مت بڑھیے کا اشاریہ ہوتا ہے۔ ترقی کا راستہ ہوتا ضرور ہے لیکن یہ نیشنل ہائی وے نہیں ہوتا۔ یہ محفوظ علاقہ ہوتا ہے اور صرف چند لوگ ترقی کرتے رہتے ہیں۔ اسے جمہوریت کہا جاتا ہے۔

انگلیوں اور انگوٹھے کے درمیان جو فاصلہ قدرت نے رکھا ہے وہ اس لیے رکھا گیا ہے کہ معاشرہ خواہ کتنا ہی مخلوط کیوں نہ ہو ذکور اور اُناث میں کم سے کم اتنا فاصلہ ضرور ہونا چاہیئے، لیکن کون پروا کرتا ہے۔

بعض ہاتھوں کی انگلیاں اتنی مضبوط ہوتی ہیں کہ ان ہاتھوں کے شکنجے میں قانون بھی اس کبوتر کی طرح دکھائی دینے لگتا ہے جو باز کے پنجے میں پہنچ کر دنیا پر آخری نظر ڈال رہا ہو۔ اسی وداعی نظر کو طائرانہ نظر کہا گیا ہے مشکل یہ ہے کہ قانون کے ہاتھ تو ہوتے ہیں

باقی صفحہ ۴۴ پر

غزلیں

پروفیسر مظفّرؔ حنفی
صدر شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی، کلکتہ ۷۳۰۰۰

لہو کے قطرے ذرا تابناک ہوجاتے
سعی تو کرتے بلا سے ہلاک ہوجاتے

ستارے ہم کو اُٹھاتے نہیں بلندی پر
تو ہم سکون سے پیوندِ خاک ہوجاتے

جنوں نے ہاتھ بڑھائے تھے ہم نے روک لیا
نہیں تو سارے گریبان چاک ہوجاتے

مِرے خلوص کی توہین ہے یہ اندازہ
کہ دوجہاں بدلِ اشتراک ہوجاتے

تم اپنے خوں میں نہاکر گناہ کرتے ہو
پرائی آگ میں جلتے تو پاک ہوجاتے

یہ کائنات مظفّرؔ کے ساتھ جاگتی کیوں
غزل کے شعر اگر ٹھیک ٹھاک ہوجاتے

پرندے پھل ہمارے توڑ لیں گے
پُجاری پھول سارے توڑ لیں گے

اگر منجدھار میں ہمّت نہ ٹوٹی
سمندر کے کنارے توڑ لیں گے

پڑی ہے پاؤں میں زنجیر کیسی
ہم اپنے سب سہارے توڑ لیں گے

بچے بالفرض بازو آندھیوں سے
تو گھبراہٹ کے مارے توڑ لیں گے

ابھی اُڑنے سے خوف آتا ہے جن کو
اُڑیں گے تو ستارے توڑ لیں گے

علامات

جاڑے کے ساتھ تیز بخار
اور پیاس پیٹ میں بائیں طرف دبانے پر درد ہوتا ہے

علاج

آدھا گلاس پانی میں آٹھ قطرے زندہ طلسمات
ڈال کر دن بھر میں ۳ دفعہ استعمال کریں
مکمل آرام کے لئے سات ۷ دن تک اسی طرح
زندہ طلسمات استعمال کیجئے۔

زندہ طلسمات
Net Contents 5 ml.
When packed 2/00
Max. Retail Price Rs.
ZINDA TILISMATH
Trade Mark No. 577
Regd. No. 175
Mfg. Lic. No. 6(3
5ml.
ZINDA TILISMA
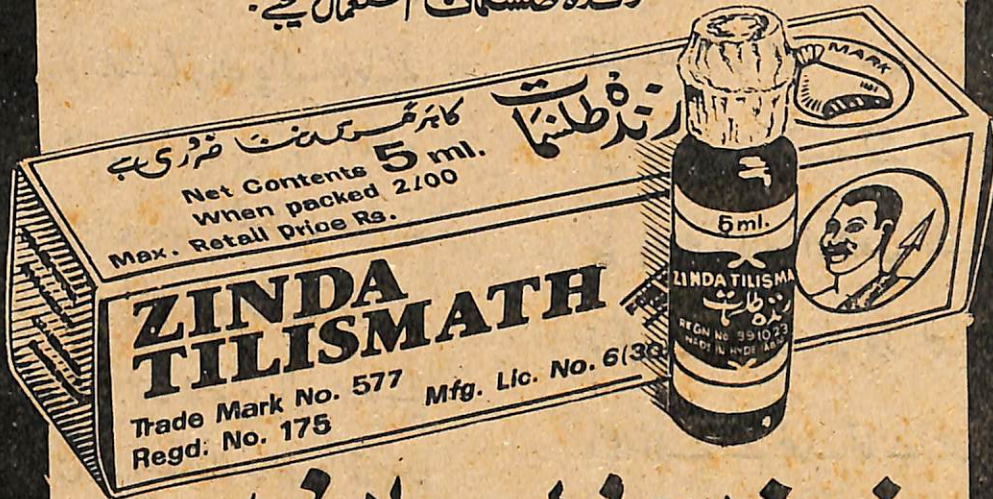
زندہ طلسمات

(یونانی دوا)

تیار کردہ: کارخانہ زندہ طلسمات۔
حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۱۳

چھاچھ

م۔ک۔ مہتاب

۱/۷۹، اے پچھم وہار، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۳

وہ لڑکی ... نہیں نہیں عورت .... نہیں لڑکی۔ یہ فیصلہ آپ ہی کریں کہ اس خاتون کو عورت کہوں یا لڑکی۔ کیونکہ ہمارے سماج میں کوئی عورت جب تک شادی شدہ نہیں ہو جاتی، لڑکی ہی کہلاتی ہے خواہ وہ عمر کی کتنی ہی بہاریں دیکھ چکی ہو۔ اگر کوئی شخص اس سے شادی کرنا چاہے گا تو وہ یہی کہے گا کہ میں پہلے لڑکی دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن نرملا غیر شادی شدہ بھی نہیں۔

ان تمام حقائق کا علم مجھے ایک عجیب طریقہ سے ہوا۔ نرملا ہمارے پڑوس میں رہتی ہے۔ اسکول میں ملازم ہے۔ میں صبح سے بس کے انتظار میں کھڑے دیکھتا ہوں۔ مجھے یہ بھی علم ہے کہ وہ کس کی لڑکی ہے۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ اچھی خوش پوش اور جدید رہن سہن کے طریقوں سے آگاہ لڑکی ہے۔ صبح وہ جب بن سنور کر گھر سے نکلتی ہے تو اس کے انداز سے اس کی عمر کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اور نہ ہی میں نے اس کے کوائف میں کبھی جھانکنے کی کوشش ہی کی ہے۔ البتہ مجھے اس کے بارے میں بہت سی واقفیت اتوار کے ایک مقامی اخبار سے ہو گئی جو صبح اس نے ہمارے ہاں سے منگوایا تھا اور شام کو لوٹا دیا تھا۔ میں رات کو جب اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ضرورت رشتہ کے کالموں میں پانچ اشتہارات پر سیاہی سے نشان لگے ہوئے تھے اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ ان میں سے کوئی بھی لڑکا چالیس برس سے کم عمر کا نہیں تھا۔

پہلا اشتہار ایک رنڈوے فوجی افسر کا تھا۔ جو چالیس برس کا تھا۔ ملازمت چھوڑ کر اب شہر سے باہر ایک بڑا پولٹری فارم چلا رہا تھا جہاں سے اسے دس ہزار روپے ماہوار کی آمدنی تھی۔ اسے اپنے اکلوتے بچے سے پیار کرنے والی ایک شفیق ماں کی ضرورت تھی۔

دوسرا اشتہار کسی ڈاکٹر نے دے رکھا تھا۔ جو ڈگریاں حاصل کرتے کرتے چالیس کی حد پار کر گیا تھا اور شہر میں ایک نرسنگ ہوم قائم کرنے کے بعد اب شادی کرنا چاہتا تھا۔ اسے کنواری یا بنا اولاد مطلقہ عورت کی ضرورت تھی جو ڈاکٹر یا اسکول ٹیچر ہو سکتی تھی۔

ہم اخبارات میں سیاسی لٹھ بازی کی خبریں ہی پڑھتے رہتے ہیں۔ حالانکہ اگر ہم کلاسیفائڈ اشتہاروں کے کالم غور سے دیکھیں تو وہاں سیاسی و سماجی جرائم سے بھی زیادہ دلچسپی کا سامان موجود ہوتا ہے۔

تیسرا اشتہار گپتا ذات کے کسی صنعت کار کا تھا جس نے صاف گوئی سے لکھ دیا تھا کہ وہ شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی کنوارا تھا۔ کیونکہ جس لڑکی سے اس نے شادی کی تھی وہ پہلے دن ہی اس سے الگ ہو گئی تھی اور کینیڈا جا کر کسی سے شادی کر لی تھی۔ اب اسے کسی بیوہ یا مطلقہ لڑکی کی تلاش تھی جس کے کوئی بچہ نہ ہو۔

چوتھا اشتہار کسی پنجابی کھتری کا تھا۔ جو کلاس ون سرکاری افسر تھا۔ جس کی بیوی تین برس ہوئے اپنا بچہ لے کر چلی گئی تھی اور کہیں اور شادی کر لی تھی۔ اب تنہائی سے اکتا کر یہ فلاسفر قسم کا شخص کسی پڑھی لکھی حسین لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ جسے بچوں میں دلچسپی نہ ہو۔ بلکہ اسے پرسکون زندگی مہیا کر سکے۔ یہ شخص بھی زندگی کی چھتیس بہاریں دیکھ چکا تھا۔

پانچواں اشتہار کسی عورت نے دے رکھا تھا جو ایک رئیس صنعت کار کی بیوہ تھی۔ اسے اپنے اکلوتے لڑکے کے لیے شریک حیات اور شریکِ کاروبار کی ضرورت تھی۔ لڑکے نے اپنی پہلی بیوی کو جو پاگل تھی قانونی طور پر الگ کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں تھی۔ یہ شخص بھی اڑتیس برس کا تھا۔

ان پانچوں اشتہاروں کا بغور جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ اشتہاروں پر نشانات ضرور اسی لڑکی نے لگائے ہوں گے۔ چونکہ یہ سب اشتہار ادھیڑ عمر کے مردوں کے ہی تھے۔ اس لیے ضروری ہے کہ یہ حسین لڑکی جس کے قریب سے گذرنے پر تیز خوشبو کا جھونکا سا آتا تھا ضرور تیس بتیس برس کی ہوگی لیکن یہ بھی تو ممکن ہو سکتا تھا کہ اس لڑکی نے یہ نشانات اپنے لیے نہیں بلکہ اپنی کسی رشتے دار یا سہیلی کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے لگائے ہوں۔ اس لیے مجھے خواہ مخواہ مغز پچی کی کیا ضرورت ہے۔

میں اخبار کا ورق پلٹ کر ایک
اقتصادی گھوٹالے کی روداد پڑھنے لگا۔
لیکن نرملا کے لباس سے اٹھنے والی خوشبو
کے جھونکے نے مجھے بکھرا گیا۔ میں لوٹ کر
پھر وہی اشتہار دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ
ہی میں یہ بھی سوچنے لگا کہ نرملا کے والد
سری چند نے جو اکثر مجھے صبح پارک میں
ملا کرتا ہے۔ کبھی اپنی لڑکی کے لیے کسی
رشتے کی ضرورت کا ذکر نہیں کیا۔ اگر اس کی لڑکی
غیر شادی شدہ تھی تو اس کے والد کی
طرف سے ایسا ذکر ایک قدرتی امر تھا۔
اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ
نشانات خود نرملا نے ہی لگائے تھے
ہوں اور وہ اس سلسلے کی خط و کتابت
خود ہی کرتی رہتی ہو۔ چونکہ آج ان کے
ہاں یہ اخبار نہیں آیا تھا اس لیے
"بی بی" نے ملازم کے ہاتھ مجھ سے یہ اخبار
منگوا بھیجا ہو۔

اشتہارات پڑھ کر میں نے
خواہ مخواہ ایک سر درد خرید لیا۔ سری چند
کو ہمارے پڑوس میں آئے تین چار
برس ہو گئے تھے۔ اس کی مجھ سے
شناسائی بھی تھی لیکن اس نے کبھی
اپنی پریشانی کا ذکر مجھ سے نہیں کیا
تھا۔ اخبار میں لگے ان نشانات نے
میرے ذہن میں تجسس جگا دیا جس نے
مجھے ایک صبح سری چند سے پارک
میں بات کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے
ابھی ذکر کیا ہی تھا کہ وہ ایک آبلے
کی مانند بہہ نکلا۔ اخبار میں نشانات
اس نے نہیں لگائے تھے۔ بلکہ اسے
اس معاملے میں کوئی دلچسپی ہی نہیں
تھی۔ یہ خط و کتابت اس کی لڑکی
ہی کرتی ہو گی جس کا اسے زیادہ علم
نہیں تھا۔ سری چند سے بات کرنے کے بعد
مجھے احساس ہوا کہ لوگ کیسے کیسے
عذاب میں مبتلا ہونے پر بھی آپ
سے مسکرا کر ملتے ہیں۔ سری چند کی
بیوی نہیں تھی۔ لڑکے کی شادی کی
تھی۔ لیکن اس کی بیوی کو اپنے شوہر کی نسبت
پڑوسیوں میں زیادہ دلچسپی تھی۔ لڑکا مجبوراً تبادلہ
کرا کر مہاراشٹر چلا گیا تھا لیکن وہاں بھی شوہر اور
بیوی ایک چھت کے تلے اجنبیوں کی مانند رہتے
تھے ——— سری چند ایک بار لڑکے
اور بہو میں مفاہمت کرانے کے لیے
مہاراشٹر گیا تھا۔ لیکن ان دونوں
نے اسے دھکے مار کر گھر سے نکال دیا
تھا۔ پانچ برس ہو گئے سری چند کو
کچھ پتہ نہیں تھا کہ ان لوگوں کا
کیا ہوا اور وہ کہاں گئے۔ بہو نے
اسے اتنا ضرور کہا تھا کہ جب تک
سری چند کی بیوی اور لڑکی گھر پہ
ہیں وہ کبھی ادھر کا رخ نہیں کرے
گی۔ بیوی چل بسی۔ سری چند مکان
فروخت کر کے اس محلے میں آ گیا تھا۔
لڑکی اور ایک ملازم کے ساتھ زندگی
کے دن پورے کر رہا تھا۔ لیکن لڑکی
بھی سری چند سے اتنی رنجیدہ تھی کہ اس
کے ساتھ کلام تک کرنا پسند نہیں کرتی
تھی۔ جب اس پر غصے میں ہیجانی
کیفیت طاری ہوتی تو وہ چائے یا پانی کا
گلاس کھانے کی تھالی اس کے منہ
پر دے مارتی تھی۔ اس لیے سری چند
صبح سویرے ہی گھر سے نکل آتا تھا اور
لڑکی کے اسکول جانے کے بعد ہی لوٹتا
تھا۔ "اس نفرت کا سبب؟" میں نے
پوچھا۔ "وہ کہتی ہے میں نے اس کی زندگی
برباد کر دی ہے۔ آپ ہی بتائیں کیا
کوئی باپ اپنی بیٹی کا دشمن ہو سکتا ہے
جس باپ نے بیٹی کو نازوں سے پالا
ہو۔ تعلیم دلائی ہو۔ ملازم کرایا ہو۔ کیا وہ
اسے کسی جہنم میں جھونک سکتا ہے؟"

"سری چند جی۔ یہ نجی معاملہ ہے۔
میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔"

"تو آپ نرملا سے خود ہی پوچھ لیں۔
وہ آپ کے ہاں بھی تو کبھی کبھی اخبار
یا میگزین لینے جایا کرتی ہے۔ مجھے تو اس
میں بس اتنی ہی دلچسپی ہے کہ میرے
مرنے کے بعد اس کا کیا ہو گا؟"

معاملہ سری چند کے ہر جملے کے
ساتھ پر اسرار ہوتا جا رہا تھا۔ ایک
روز جب میں یہاں سے لوٹ رہا تھا تو میں
نے اسے بس اسٹاپ پر کھڑے دیکھا۔
اس نے سر جھکا کر آداب کہا۔ اور میں
نے اس سے کہہ دیا کہ ایک روز وہ
جو امریکی رسالہ لینے آئی تھی وہ اب
آ گیا ہے۔

اسی دن شام کو جب میں دفتر
سے لوٹ کر آیا تو نرملا وہ میگزین
لینے کے لیے آئی۔ اسی روز میں نے پہلی
بار اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔
وہ شاید ابھی سو کر اٹھی تھی۔ اس کی
ڈھلی ڈھلی آنکھوں میں خواب مچل رہے
تھے۔ گردن تک لہراتے ہوئے خمدار
گیسوؤں میں ٹھیک سے برش بھی نہیں
کیا تھا۔ لب ضرور قدرے گلابی تھے۔
ملیح رنگت میں کالی بندیا بہار دے
رہی تھی۔ بھاری بھرکم سفید قمیص
شلوار میں وہ خوب جچ رہی تھی۔ وہ
آتے ہی ریک میں رکھی کتابیں دیکھنے
لگی۔ میں نے امریکی رسالے اس کے
حوالے کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔
"آخر کب تک یہ کتابیں اور رسائل
پڑھتے رہنے کا ارادہ ہے۔ زندگی کی
کتاب بھی پڑھنا شروع کرو۔"

"بہت پڑھ لی ہے یہ کتاب۔ بند ہی
رہے تو اچھا ہے۔"

"میں سری چند سے کہوں گا۔"

"رہنے دیجیے۔ سر میں ان کے اعمال
کی سزا ہی تو بھگت رہی ہوں۔"

اب میرے ہاتھ میں دھاگے
کا سرا آ گیا تھا۔ میں نے شربت
کا گلاس منگوا کر اسے کرسی پر بیٹھ
جانے کے لیے کہا۔ پنکھا قدرے
تیز کر دیا۔ جب میں نے سری چند
کی بزرگی اور شرافت کی تعریف
شروع کی تو نرملا اونچی آواز میں
سری چند پر لعنت ملامت کرنے
لگی جن کی کوتاہ اندیشی نے اس
گھر کو جہنم بنا دیا تھا۔

اگر شادی ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ.....

لیکن وہ میری بات کاٹتے ہوئے کہنے لگی۔

"شادی کے بعد ہی تو یہ گھر جہنم بنا ہے اور اب جلتا ہوا جہنم بن سکتا ہے۔ کیا آپ مجھے کنواری خیال کرتے ہیں۔ میں شادی شدہ ہوں لیکن مجھے لباس اور میک اپ سے کنوارے پن کا بہروپ رچائے رکھنا پڑتا ہے...... کیونکہ میں کنواری رہنا نہیں چاہتی۔"

"تو کیا گزشتہ اتوار اخبار میں ضرورت رشتہ کے اشتہاروں پر نشانات آپ نے لگائے تھے؟"

"اور کون لگا سکتا ہے۔ پتاجی تو ایک بار ہاتھ جلا چکے ہیں۔ وہ یہ تجربہ پھر نہیں کر سکتے۔ میں جو زندگی کی سِل پر پس چکی ہوں۔ ایک بار پھر اپنے ہاتھوں کی مہندی بننا چاہتی ہوں۔"

"لیکن وہ اشتہار تو عجیب قسم کے تھے۔"

تو کیا آپ سمجھتے ہیں کوئی سیدھا سادہ عام قسم کا آدمی مجھ سے شادی کرے گا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ آپ زیادہ عمر کی نہیں۔ کنواری لڑکی ہی دکھائی دیتی ہیں۔"

"یہ تو آپ کا فریبِ نظر ہے۔ میں کسی کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی۔ میں چوبیس برس کی تھی جب میری شادی ہوئی تھی۔ اس المیہ کو آٹھ برس گزر چکے ہیں۔ اس کے بعد میں نے ایسے ایسے روح فرسا منظر دیکھے ہیں کہ میرے اندر روح نام کی کوئی چیز باقی ہی نہیں رہی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ شری چند کا انتخاب غلط تھا۔"

"انتخاب غلط نہیں تھا سوچنے کا انداز غلط تھا۔ انھیں میرے حال کی نہیں مستقبل کی فکر تھی لڑکا امیر خاندان سے تھا۔ والد ایک رئیس آدمی تھے۔ شوہر تعلیم یافتہ بزنس مین تھا۔"

"پھر شری چند نے کیا غلط کیا؟

"بس یہی کہ ایسی کوئی خرابی نہیں تھی جو اس لڑکے میں موجود نہ تھی۔"

"پھر بھی۔"

"سب سے پہلے تو یہ کہ اسے میری آزادی پسند نہیں تھی۔ لڑکی گھر کی ملازم ہوتی ہے۔ سرکاری

غزل

رفعت سروش

اے-۸۰- سیکٹر ۲۷، نوئیڈا-۲۰۱۳۰۰

رنجش بے جا نہیں ہے، کوئی ناچاقی نہیں
پھر بھی میخانے میں جانے کیوں مرا ساقی نہیں

اس طرح اُلجھا ہے کچھ افسانۂ ہجر و وصال
کس طرح سُلجھائیے، کوئی سرا باقی نہیں

کوئی منزل ہے، نہ جادہ اور نہ اِک سمتِ سفر
منتشر ہیں سب کہ میرِ کارواں باقی نہیں

وقت کے گرداب میں ہم گھر گئے اس طور سے
جسم تو زندہ ہیں، روحِ زندگی باقی نہیں

میرا ہر اِک لفظ میرے تجربوں کا عکس ہے
شعر تو کیا، میری کوئی بات الحاقی نہیں

کون سی منزل ہے آخر یہ محبت کی سروش
بھولنے والے سے ربطِ آرزو باقی نہیں

اسکول کی نہیں۔ دو چار لوگ مجھ سے ملنے آئے تو میرا چال چلن خراب قرار دیا گیا۔ میں نے اپنے کالج کے دوستوں کے ساتھ ایک ڈرامے میں حصّہ لیا تو مجھے خاندان میں بدمعاش مشہور کر دیا گیا۔ جہاں میری دلچسپی صرف اپنے شوہر دھرم میں تھی وہاں دھرم کی دلچسپی میرے سوا باقی ہر عورت میں تھی۔ مجھے سگریٹ پانی سے سخت نفرت تھی۔ لیکن دھرم کے ہاں اسے خاندانی ٹھاٹ باٹ کی علامت خیال کیا جاتا تھا۔ وہاں لکھنے پڑھنے کو فضول خرچی شمار کیا جاتا تھا۔ میں بلبل کی مانند چہکنا چاہتی تھی۔ لیکن وہاں مجھے پر کاٹ کر پنجرے میں بند کر دیا جاتا تھا

اور کیا بتاؤں سر کہ میرے سامنے کیا کیا ہوتا تھا۔ زبان کھلنے پر میری چمڑی ادھیڑ دی جاتی تھی۔ ان لوگوں نے میرے خلاف پولیس میں گھر سے بھاگنے تک کے الزامات کی رپورٹیں درج کرائیں۔

میں گھر آگئی۔ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ چار برس تک ان امیرزادوں نے جن کے ساتھ ہر پیشی پر نئی حسینائیں ہوتی تھیں۔ مجھے اتنا پریشان کیا کہ میں نیم پاگل ہو گئی۔ وہ مجھے زندگی بسر کرنے کا خرچہ دے کر زندہ درگور کرنا چاہتے تھے۔ آخر ایک مجسٹریٹ کو مجھ پر رحم آگیا اور چار برس ہوئے اس نے مجھے اس جہنم سے نجات دلا دی۔ اس دوران میں ہمارا گھر جہنم بن چکا تھا۔ والدہ چل بسی تھی۔ بھائی گم ہو گیا تھا۔ والد میرے بوجھ سے شکستہ پا اور نڈھال ہو چکا تھا۔

نرملا نے آنکھیں صاف کیں۔ رسالے اٹھائے اور زیر لب کچھ کہتے کہتے باہر چلی گئی۔ وہ اتنی ہراساں دکھائی دے رہی تھی گویا کسی ہرنی کو جنگل میں بھیڑیوں نے گھیر لیا ہو۔ جاتے جاتے وہ میرے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا کر گئی تھی۔ میں نے سوچا۔

"اس لڑکی کی مدد کرنی چاہیے۔ ورنہ گھبرا کر یہ جس قسم کے اشتہارات پر نشان لگا رہی ہے ان سے تو وہ اور بھی گہرے بھنور میں پھنس سکتی ہے۔"

ایک دن میں نے نرملا کو بلا کر بتایا کہ میں ایک بینک کے مینیجر کو جانتا ہوں جس کی بیوی کار حادثے میں ہلاک ہو گئی تھی۔ اسے ایسا صدمہ ہوا کہ اس نے پھر شادی نہیں کی۔ حالانکہ وہ اس تنہائی سے اکتا چکا ہے۔

نرملا میری تجویز سے متفق تھی۔ اور میں نے سُدھیر کو پھر سے شادی کے لیے رضامند بھی کر لیا۔ ایک دن میں نے دونوں کو اپنے ہاں چائے پر بھی بُلایا۔ نرملا نے مجھے بتایا کہ آدمی شکل و صورت، عہدے اور حیثیت سے تو ٹھیک ہے۔ اور سُدھیر نے بھی فون پر یہی کہا تھا کہ لڑکی دیکھنے اور ملازمت کے لحاظ سے موزوں ہے۔ کیا اس کے والد کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا میں نے سُدھیر کو بتا دیا کہ اُس کے والد کو اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ سب کچھ لڑکی کو خود ہی کرنا ہے۔ اگر وہ کچھ اور پوچھ تاچھ کرنا چاہتا ہے تو میرے ہاں آکر لڑکی سے مل سکتا ہے۔ لیکن سدھیر سب کچھ مجھ پر ہی چھوڑ دینا چاہتا تھا۔

اس کے برعکس نرملا کا رویہ کچھ مختلف تھا۔ اس لیے میں نے اُس سے کہہ دیا کہ یہ اُس کی دوسری زندگی کا سوال ہے۔ وہ سُدھیر کے بارے میں جو کچھ چاہے اور جہاں سے چاہے پوچھ سکتی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے نرملا نے سُدھیر کے بینک کے ایک شخص سے کچھ دریافت بھی کیا۔ کچھ روز تک اس محاذ پر کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ میں نے سمجھ لیا کہ نرملا کے تقاضے کچھ مختلف قسم کے ہیں شاید سدھیر انھیں پورا نہ کر سکے۔ لہٰذا میں نے بھی اس معاملے میں مزید دلچسپی نہیں لی۔

لیکن ایک اتوار وہ خود ہی میرے پاس آگئی۔ اخبار دیکھتے ہوئے خود ہی کہنے لگی۔ "آپ میرے جواب کا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"ہاں! آخر مجھے بھی اُس شریف آدمی کو کوئی جواب دینا ہے۔"

"بات یہ ہے شرما جی کہ میں نے ایک دو شناسا لوگوں سے سُدھیر کے بارے میں پوچھ تاچھ کرائی ہے۔ کسی نے کوئی خراب رپورٹ نہیں دی۔ لیکن مجھے ان کی باتوں پر یقین نہیں آرہا۔"

"پھر آپ چاہتی کیا ہیں؟ کیا میں سُدھیر کو بتا دوں کہ آپ کو اس رشتے میں دلچسپی نہیں ہے۔"

"نہیں شرما جی نہیں۔ میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔ جلد از جلد اس گھر سے جانا چاہتی ہوں۔ اپنے والد کو آرام سے زندہ رہنے اور بنا کسی غم کے مرتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ آپ کے اور میرے درمیان اب کوئی راز باقی نہیں رہا۔ آپ ہی کچھ باتوں کے بارے میں پتہ کر کے مجھے اطمینان دلادیں۔"

"مثلاً۔" میں نے پوچھا۔

"پہلے تو یہ یقین کرادیں کہ سُدھیر کی بیوی واقعی کار حادثے میں ماری گئی تھی اور اُس نے بیوی کو قتل نہیں کیا۔ اگر سُدھیر کار میں تھا تو وہ کیسے بچ گیا؟"

میں نے سُدھیر سے بات کی اور پوری طرح اطمینان کر لیا کہ واقعی کار حادثہ ہوا تھا جس میں سُدھیر زخمی ہوا تھا اور وہ لوگ کون سے ہسپتال میں داخل رہے تھے۔

نرملا اب قریب ہر روز شام کو مجھ سے ملنے لگی تھی وہ اپنے شکوک رفع کرنے کے لیے ہر روز کوئی نیا سوال لے آتی تھی۔ اور میں سُدھیر سے فون پر بات کر کے اس کے شکوک رفع کر دیتا تھا۔ مثلاً۔

"وہ شراب پی کر گھر تو نہیں آتا۔"

"نہیں۔"

"اُسے سگریٹ پھونک پھونک کر گھر کا ماحول خراب کرنے کی عادت تو نہیں۔"

"نہیں، وہ سگریٹ پیتا ہی نہیں۔"

"کیا اُسے جوئے کی عادت تو نہیں۔ سٹہ بازار کا شوقین تو نہیں۔"

"کیا وہ دوسری لڑکیوں کی صحبت پسند کرتا ہے؟ کیا دوسری عورتیں تنہائی کا فائدہ اُٹھا کر اُس کے ہاں آتی جاتی ہیں؟"

"نہیں۔"

"کہیں اُسے کلبوں میں گھومنے اور دیر رات تک دوستوں کے ہاں ٹھہرنے کی عادت تو نہیں۔"

"نہیں بابا۔ نہیں۔ اکیلا آدمی دیر سے گھر آسکتا ہے۔ شادی کے بعد کیوں آئے گا؟"

"کیا اس نے پہلی بیوی کو کبھی پیٹا تھا؟"

"اُسے یاد نہیں۔"

"کیا وہ اُسے ملازمت جاری رکھنے دے گا۔ اور اگر وہ ملازمت کرے گی تو کیا وہ تنخواہ اُس سے لے لے گا۔ یا اُسے اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرنے دے گا؟"

"ملازمت کی اجازت ہوگی۔ گھر کے مالیات تو بیوی کے سپرد ہوتے ہیں اور اتفاق رائے سے ہی خرچ ہوتا ہے۔"

"اگر کبھی میرے دوست مجھ سے ملنے آئیں تو کیا وہ مجھ پہ بدچلنی اور آوارگی کے الزامات عائد کر کے مجھے گھر سے تو نہیں نکال دے گا؟"

"نرملا جی! یہ تو باہمی اعتماد کا معاملہ ہے۔ اگر آپ اس سے ملنے والی خواتین یا بینک کی لڑکیوں کے بارے میں شک نہیں کریں گی تو وہ آپ پر ایسے الزامات کیوں لگائے گا۔"

"کیا وہ مجھے کلب یا اسکول کے ڈرامے میں کسی مرد کے ساتھ کام کرتے دیکھ کر جل بھن تو نہیں جائے گا اور رات کو دروازہ کھولنے سے انکار تو نہیں کرے گا؟"

"اگر بیرونی نرملا کے قدم درست رہیں تو وہ تمھارے اندر کی فنکاری کو کچلنے کے حق میں نہیں ہے۔ اگر تم اس کے لیے دروازہ کھُلا رکھو گی تو وہ کیوں بند کرے گا؟"

"کیا سُدھیر کے رشتے دار اُن کی ازدواجی زندگی پر حاوی تو نہیں رہیں گے اور کیا وہ اُن کے بہکاوے پر اُسے عدالت کے

فرمانِ الٰہی

اور اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیز کو نہ پکارنا جو نہ تمہارا کچھ بھلا کر سکے اور نہ کچھ بگاڑ سکے اگر ایسا کرو گے تو ظالموں میں ہو جاؤ گے (۱۰۶) اور اللہ تم کو کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا اس کا کوئی دور کرنے والا نہیں اور اگر تم سے بھلائی کرنی چاہے تو اس کے فضل کو کوئی روکنے والا نہیں۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے فائدہ پہنچاتا ہے اور وہ بخشنے والا مہربان ہے (۱۰۷) (سورۂ یونس)

کٹہرے میں کھڑا تو نہیں کر دے گا؟"

"نرملا! تم یہ کیسے کیسے سوالات لے آتی ہو۔ وہ ان کا جواب دینے میں بہت پریشانی محسوس کرتا ہے۔ شادی تم دونوں کی ہوگی۔ اس میں دیگر رشتے داروں کا کیا دخل ہوگا۔ سُدھیر تو اپنے گھر کو ایک چھوٹی سی جنت میں تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ جہاں اُس کے عزیز بھی خوشی کی جھلک دیکھ سکیں۔"

"کیا سُدھیر ذہنی طور پر بزرگ تو نہیں ہو چکا۔ کیا وہ اُس کے دبے ہوئے ارمانوں کے پھولوں کو پھر سے کھلنے دے گا۔ اگر میری جوانی کے دن جو عدالتوں کے برآمدوں میں بھٹکتے رہے لوٹنے لگیں تو کیا وہ ان پر کواڑ تو نہیں بند کر دے گا؟"

"سُدھیر کا جواب ہے کہ جائز حد تک ہر بات برداشت ہو سکتی ہے۔"

"کیا وہ حال میں زندہ رہنا چاہتا ہے یا مستقبل میں؟"

"اس کا سُدھیر نے کوئی جواب نہیں دیا۔"

"کیا وہ ناچاقی کی صورت میں مصالحت میں یقین رکھتا ہے یا طلاق کو چھٹکارا پانے کا آسان راستہ خیال کرتا ہے؟"

"نرملا! وہ شریف آدمی آپ کے ان استفسارات کو سمجھ نہیں پایا بلکہ میرے معنی خیز اندازِ بیان سے مجھ سے ہی پوچھتا ہے کہ میں ہر روز یہ کیا قصہ لے آتا ہوں۔ وہ سمجھتا ہے کہ ازدواجی جھگڑے بادل کے ٹکڑے ہوتے ہیں جو زندگی کے سورج کو گہنا نہیں سکتے اگر وہ ہر لحاظ سے شریف انسان نہ ہوتا تو میں اُسے پھر سے ازدواجی زندگی شروع کرنے کا مشورہ ہی کیوں دیتا؟"

"کیا وہ ہمارے گھر کے عذاب اور اذیت سے واقف ہے؟"

"ہاں۔ ہاں۔" میں نے قدرے خفگی سے کہا۔ اب فیصلہ آپ لوگوں نے ہی کرنا ہے؟"

نرملا پھر پورا ہفتہ میرے ہاں نہیں آئی۔ اگلے اتوار ہی دکھائی دی۔ اس کا باپ بھی اُس کے ہمراہ تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ دونوں رضامند تھے۔ وہ "ہاں" کا لفظ اپنے والد سے کہلوانا چاہتی تھی۔ اور بوڑھا سری چند کہہ رہا تھا۔

"ہمیں یہ رشتہ منظور ہے۔"

میں نے نمبر ملا کر سُدھیر سے بات کی اور کہا۔

"لیکن سُدھیر کو یہ رشتہ منظور نہیں۔"

"کیوں؟" نرملا کا مُنہ کھُلا رہ گیا۔

"وہ کہہ رہا ہے کہ میں ایسی جھکّی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔"

اب میں اُسے فون پر کیا سمجھاتا کہ وہ جھکّی نہیں۔ دودھ کی جلی ہے۔ ●●

معیاری کتابوں کا بہترین انتخاب

اپنی پسند کی کتابیں گھر بیٹھے طلب کیجیے

طب

- طبِ نبویؐ — 10/-
- کنز التشخیص / محمد رفیق حجازی — 35/-
- حاذق / مسیح الملک حکیم اجمل خان — 75/-
- مطبِ عملی / افادات مسیح الملک — 50/-
- ذیابیطس اور صحت — 40/-
- ذیابطیس، صحت اور موٹاپا — 20/-

ناول

- گردش / سراج انور — 35/-
- شیشے کی چٹان / سراج انور — 45/-
- لگن / بشریٰ رحمٰن — 60/-

دینیات

- داستان ایمان فروشوں کی I تا V / التمش — 210/-
- فلاح دارین / منظور احمد عباسی — 25/-
- مآثر حکیم الامت / محمد عبد الحیؒ — 25/-
- روح کی بیماریاں اور ان کا علاج I / مولانا محمد اختر — 20/
- روح کی بیماریاں اور ان کا علاج II / مولانا محمد اختر — 20/
- جنت کی سیر / خواجہ شمس الدین عظیمی — 15/-
- روحانی نماز / خواجہ شمس الدین عظیمی — 15/-

علاج معالجہ

- رنگ و روشنی سے علاج / خواجہ شمس الدین عظیمی — 10/
- سبزیوں سے علاج / ڈاکٹر بلیغ الدین جاوید — 12/
- پھلوں سے علاج — 15/-
- زیتون کے تیل سے علاج — 15/-
- غذا سے علاج / عبد اللہ فاروقی — 15/-
- پانی سے علاج / ڈاکٹر زرینہ مقبول — 12/-

(بلا عنوان)

- گھریلو طبی علاج — 18/-
- بیماریوں کا قدرتی علاج — 12/-
- دل کی بیماریوں کا علاج — 15/-
- بلڈ پریشر کا علاج / سلیم احمد صدیقی — 15/-

تندرستی اور صحت

- صحت و زندگی — 25/-
- صحت بخش مقوی غذائیں I / حکیم نور محمد — 20/-
- صحت بخش مقوی غذائیں II / حکیم نور محمد — 20/-
- غذا کے کرشمے / حکیم نور محمد — 10/-
- تندرستی کے راز — 10/-
- جوڈو — 30/-

پامسٹری اور عملیات

- آئینۂ عملیات / صوفی عزیز الرحمٰن — 40/-
- نقشِ سلیمانی — 30/-
- لکیریں بولتی ہیں / اظہر کلیم — 15/-
- لال کتاب یعنی آسان پامسٹری / محبوب اظہر — 25/
- مستقبل شناسی / طاہر قریشی — 12/-

کشیدہ کاریاں

- بیسویں صدی کشیدہ کاری — 15/-
- روبی کشیدہ کاری — 9/-
- بچوں کے کپڑوں کے ڈیزائن — 16/-
- روحی ٹٹنگ بک — 13/-

حسن و صحت

- یوگا کے حسین انداز / اظہر کلیم — 10/
- جسم کو پرکشش بنانے کے راز / شائستہ خاتون — 15/
- حسین رہو، جوان رہو / محمد شاہ جہاں — 10/-

باورچی خانہ

- رابعہ کا شاہی دسترخوان / رابعہ سعید — 25/-
- میٹھے پکوان — 12/-
- منور جہاں کا دسترخوان / منور جہاں — 20/-

جنسیات اور ازدواجی زندگی

- پریم شاستر — 25/-
- کام شاستر — 25/-
- گربھ شاستر — 25/-
- مردانہ قوت بڑھائیے — 20/
- جنسی ملاپ میں مرد کا حصہ — 15/-
- جنسی ملاپ میں عورت کا حصہ — 15/-
- ماڈرن برتھ کنٹرول — 20/-
- حمل سے پیدائش تک — 20/-
- کامیاب ازدواجی زندگی / حکیم خان — 20/-
- شادی کا جنسی پہلو / حکیم خان — 15/-
- جنسی تعلقات کا فن / حکیم خان — 15/-
- جنسی طاقت میں اضافہ / حکیم خان — 20/-
- ترغیباتِ جنسی / علامہ نیاز فتح پوری — 50/-

تنقید و تحقیق

- اردو ناول میں طنز و مزاح / ڈاکٹر شمع افروز زیدی — 100/-
- فکر تونسوی حیات اور کارنامے / ڈاکٹر شمع افروز زیدی — 100/-

خط و کتابت / ترسیلِ زر کا پتہ

بیسویں صدی پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ بی۔۱، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

غزلیں

سیّد حباب ترمذی
۱۰۲۰۲، فورم پارک ۴۸، ہوسٹن ٹی ایکس۔ ۷۷۰۳۶، امریکہ

ہم رَہ نوَردِ شوق ہیں جس سمت چل پڑیں
ہر گام پر نئی نئی راہیں نکل پڑیں

آنکھوں سے خواہ خون کے دریا اُبل پڑیں
ممکن نہیں جبینِ محبت پہ بَل پڑیں

ایسی کوئی حکایتِ ہستی سُنائیے
جو لوگ غم زدہ ہیں خوشی سے اُچھل پڑیں

ہاں ہاں نقیبِ صبحِ بہاراں وہی تو ہیں
پھولوں کے جو مفاد میں کانٹوں پہ چل پڑیں

ڈر ہے لباسِ خضر میں بھی راہ زن نہ ہو
چلنے کو ہم تو خضر کے ہم راہ چل پڑیں

بے التفاتیوں سے کوئی فائدہ نہیں
ہم بھی کہیں تمہاری ڈگر پر نہ چل پڑیں

جب اندرونِ خانہ بھی محفوظ ہم نہ ہوں
سر سے کفن لپیٹ کے باہر نکل پڑیں

اشکوں سے چھٹ نہ جائے کہیں تیرگیٔ غم
پلکوں کی اوٹ سے نہ ستارے نکل پڑیں

اس درجہ بے خبر بھی نہیں ہیں یہ اہلِ دل
جانا کہیں ہو اور۔ کہیں اور چل پڑیں

ایسے بھی بے شمار شناور ہیں جو حبابؔ
طوفاں میں ڈوب کر سرِ ساحل نکل پڑیں

خلوصِ دل کا تم کو پاس کب ہے
محبّت مجھ سے پہلے تھی نہ اب ہے

بہ خاموشی تکلّم زیرِ لب ہے
یہ اندازِ تخاطُب بھی عجب ہے

نظر برہم۔ تبسّم زیرِ لب ہے
غضب ہے اُن کا یہ عالم غضب ہے

جُنوں کا ہر قدم خضرِ طلب ہے
مجھے اس بات سے انکار کب ہے

اُجالوں کی تمنّا کرنے والو!
ابھی سورج پسِ دیوارِ شب ہے

تمہیں سب کچھ ہے کہنے کی اجازت
ہمارا کچھ نہ کہنا بھی غضب ہے

جو پہنچا ہے تبسّم سے تمہارے
وہ زخمِ غم نہیں زخمِ طرب ہے

تمہارے زُلف و عارض اللہ اللہ
انھیں کا نام شاید روز و شب ہے

میں پاگل پن کی حد تک ہوں تمہارا
مگر اس کا تمہیں احساس کب ہے

ہمیشہ قلب کی گہرائیوں سے
مجھے اپنا وہ سمجھیں بات جب ہے

خوشی کی رَو میں اِک دن بہہ گیا تھا
حبابؔ اچھّا تو یہ غم کا سبب ہے

پھر ہوائے دیارِ یار آئی
عطر بیز آئی مُشک بار آئی

پہنے گُل کی قبا بہار آئی
یہ خزاں کا لباس اُتار آئی

کس طرح آج یادِ یار آئی
دل گرفتہ و اَشک بار آئی

سچ تو یہ ہے کہ مجھ کو سچّی ہنسی
زندگی میں بس ایک بار آئی

دل میں یادِ وطن کے پھول کھلے
آج پردیس میں بہار آئی

جب چمن میں کوئی کلی چٹکی
میں یہ سمجھا صدائے یار آئی

دل کو پھولوں کی آرزو تو بہ
جیسے ویرانے میں بہار آئی

ایسا لگتا ہے جیسے ہر دھڑکن
دل کی بازی خود اُن سے ہار آئی

مجھ کو دل پر تو دل کو مجھ پہ ہنسی
جانے کیوں آج بار بار آئی

کون دنیا میں مطمئن ہے حبابؔ
زندگی کس کو سازگار آئی

(چوتھی قسط)

راستے اور منزل

مسرور جہاں

۹۵/۱۹۵ اکراؤن گیٹ، جگت نرائن روڈ، بمقابل بڑا چھتہ، سٹی اسٹیشن۔ لکھنؤ ـ ۲۲۶۰۰۱

اب تک کی کہانی کا خلاصہ: شمائل کے بابا نے مرنے سے قبل جب انکشاف کیا کہ وہ اُس کی بیٹی نہیں تو وہ سکتے میں رہ گئی۔ لیکن بابا نے اُکھڑی سانسوں کے درمیان اُسے اس کے والدین نیز اس کے ملنے کی پوری روداد سنادی۔ بابا کے انتقال کے بعد شمائل کی دنیا تاریک ہوگئی لیکن وہ پڑھی لکھی بہادر لڑکی تھی۔ اس لیے ہراساں ہونے کے بجائے ایک عزم لے کر لال کوٹھی کے مکینوں سے ملنے چل پڑی۔ وہاں پہنچنے پر پہلے اس کا سامنا نصیبن بوا سے ہوا۔ شمائل نے نصیبن کو سولہ سترہ برس پہلے کی وہ رات یاد دلائی تو نصیبن خوفزدہ ہوگئی اور شمائل کو یقین ہوگیا کہ وہ صحیح جگہ پہنچی ہے۔ لیکن شمائل نے کہا اب گزری باتوں کو یاد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں میں یہاں تمہاری بھانجی بن کر رہوں گی۔ تم سب کو میرا نام شانو بتانا۔ نصیبن نے اسے بیگم صاحبہ سے بھی ملوایا۔ شمائل سے مل کر بیگم صاحبہ بہت خوش ہوئیں اور انھیں ایسا لگا جیسے اُن کی مرحوم بیٹی واپس آگئی ہے۔ شمائل بھی جی جان سے بیگم صاحبہ کی خدمت کرتی۔ انھوں نے شمائل کی خدمت سے متاثر ہوکر اُسے کالج میں داخل کرادیا۔ شمائل نے عباد جیسے بگڑے ہوئے نوجوان کو بھی انسان بنانے کی کوشش شروع کردی۔ عباد اس کا پیار پاکر سرشار ہو اٹھا اور آپو آپو کی رٹ لگائے نہ تھکتا اسی اثنا میں گاؤں سے سردار صاحب بھی آگئے اُن کے آنے سے شمائل کو اُن کے تئیں ذرا بھی محبت نہ جاگی بلکہ بیگم صاحبہ کے ساتھ اُن کا رویّہ دیکھ کر اُسے تکلیف ہوتی تھی ابھی وہ مستقبل کے لیے منصوبے بنا ہی رہی تھی کہ ڈاکٹر تمثال حسن کی آمد سے اس کے خیالات منتشر ہوگئے۔ اب آگے پڑھیے:-

تمثال کے دوسرے والد عزیز صاحب ٹھیکے داری کرتے تھے۔ یوں وہ اچھے انسان تھے لیکن تمثال نے انھیں اپنے باپ کی جگہ کبھی قبول نہیں کیا تھا۔ حالانکہ عزیز صاحب نے انھیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا اور شروع میں انھوں نے بہت کوشش کی کہ تمثال ان کے پاس رہیں لیکن اسے ریاض صاحب اور تمثال، دونوں نے منظور نہیں کیا۔ تمثال تو اپنے ماموں جان کو چھوڑ کر کہیں رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ باپ کی جدائی کا غم تازہ تھا۔ اتنے ناسمجھ بھی نہیں تھے کہ موت کے معنی نہ سمجھتے ہوں۔ ایسے میں ماموں اور ممانی نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا، تو وہ انھیں کے ہوکر رہ گئے۔ چونکہ ان کی امی آرام سے تھیں خوش تھیں اس لیے انھوں نے سوتیلے باپ سے کھلم کھلا نفرت اور بیزاری کا بھی اظہار نہیں کیا۔ اس سے ماں کو رنج ہوتا۔ ماں سے ملنے وہ برابر جاتے تھے، لیکن جب ایک کے بعد ایک اُن کے تین بچے ہوگئے تو پھر مصروفیت اور بچوں کی محبت میں تمثال کی جدائی کا دکھ بھی کم ہوگیا۔ تمثال بھی اپنی پڑھائی میں مصروف رہتے تھے اور جب وہ امریکہ سے اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس آئے تو تینوں بھائی بہن بڑے ہوچکے تھے۔ ایک بہن کی شادی ہوگئی تھی۔ ایک بہن اور ایک بھائی ابھی زیر تعلیم تھے۔ بھائی بہن تمثال کو بہت چاہتے تھے۔ انھیں بھی سب سے بہت محبت تھی۔ آخر کو ایک ماں کی اولاد تھے، لیکن باپ سے دوری کچھ اور بڑھ گئی تھی اور ان سے کوئی خاص ربط ضبط نہیں تھا۔ آمنا سامنا ہوتا، تو بات سلام و دعا سے آگے نہ بڑھتی۔ ایک موقع پر عزیز صاحب نے بیوی سے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا کہ تمثال کی شادی ان کی بھانجی پری وش سے ہوجائے۔ بیوی نے یہ مسئلہ بھائی کے سامنے رکھا، تو انھوں نے انکار کردیا۔ وہ اس معاملے میں تمثال پر کوئی زبردستی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ورنہ ان کے خاندان میں ہی کئی لڑکیاں شادی کے قابل تھیں۔ خود اُن کی دونوں بیٹیاں بیاہی جاچکی تھیں۔ ایک بیٹا تمثال کے برابر تھا۔ ایک اس سے چھوٹا تھا۔ اس لیے ان پر خود غرض یا مطلب پرستی کا الزام بھی عائد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ دراصل وہ بے حد روشن خیال اور کشادہ دل انسان تھے اور انھوں نے شادی کا معاملہ تمثال کی پسند پر چھوڑ دیا تھا۔ اور بہن کو سمجھا بجھا کر بات ختم کردی تھی۔

تمثال کو نہ سوتیلے باپ پسند تھے اور نہ ہی اُن کے گھر والے۔ نئی نئی دولت آئی تھی۔ اس لیے سب لوگ بے حد مغرور، خود پسند اور چھچھورے ٹائپ کے تھے۔ تمثال کی تربیت میں ریاض صاحب کی اَن تھک محنت اور توجہ شامل تھی۔ اس لیے وہ وہی بنے جو ریاض صاحب نے انھیں بنانا چاہا۔ وہ اپنے ماموں جان کا عکس تھے۔ وہی سنجیدگی اور متانت۔ ویسا ہی وقار اور رکھ رکھاؤ اور بے حد سلجھی ہوئی طبیعت۔ رحم دل اور مروّت ان کے کردار کے روشن پہلو تھے۔ اگر ماموں

کی کوئی بیٹی اُن کے جوڑ کی ہوتی اور وہ جھوٹ موٹ اشارہ بھی کر دیتے تو تمثال ان کے حکم پر سر جھکا دیتے۔ وہ اپنے محسن، مربی اور سرپرست کو عقیدت کی حد تک چاہتے تھے یہ بات فائزہ بیگم اور عزیز صاحب بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ دولت کی تمثال کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے اس لیے انھیں دولت سے ریجھایا نہیں جا سکتا۔ اس کے علاوہ اور کوئی وصف ان کے خاندان کی لڑکیوں میں تھا بھی نہیں۔ تعلیم کا جہاں تک سوال تھا لڑکے تو بزنس میں لگے ہوئے تھے لڑکیاں دسواں آٹھواں پاس فیل کر کے بیوٹی پالر اور شاپنگ سینٹر کے چکر لگانا زیادہ پسند کرتی تھیں۔ اس لیے تمثال کا معاملہ سردست ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

تمثال ایک عرصے کے بعد چچی سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے۔ جب یہاں اُن کی پوسٹنگ ہوئی تو انھیں اس شہر میں بس یہی ایک کشش محسوس ہوئی کہ یہاں ان کے چچا جان کا گھر تھا۔ اور چاہنے والی چچی جان تو مستقل یہیں رہتی تھیں۔ انھیں اپنے ددھیال والوں سے بہت محبت تھی۔ پھر سگوں میں تو بس یہی دو نوں تھے۔ باقی رہے دور قریب کے رشتے دار تو سب میں آپس میں زمین و جائیداد کے لیے ہمیشہ کوئی نہ کوئی تنازعہ کھڑا رہتا تھا۔ تمثال کے والد کے حصّے کی زمین اور جائیداد سب سردار صاحب کے زیرِ نگرانی تھیں۔ وہ اس معاملے میں بے حد ایماندار اور کھرے تھے اور سال کے سال مجموعی آمدنی کا نصف حصّہ اپنے بھتیجے تمثال کے نام سے جمع کرتے رہتے تھے تاکہ وہ جب چاہے اگر اپنا پیسہ لے لیں۔ انھیں بھاوج کے عقدِ ثانی کا ملال نہیں تھا۔ یہ تو خدا اور رسولؐ کا حکم تھا، لیکن انھیں تمثال کی جدائی کا ملال ضرور ہوا تھا۔ لڑکے تو ان کے خاندان میں ویسے بھی ولی عہد سے کم نہیں سمجھے جاتے تھے۔ بھائی کا بیٹا بھی انھیں اپنی اولاد کی مانند ہی عزیز تھا پھر بھلا اس کا حق غصب کرنے کا کیا سوال اٹھتا تھا۔ انھوں نے تو بارہا تمثال کے حصّے کی رقم ریاض صاحب کو دینا چاہی، لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ بھی جانتے تھے کہ تھوڑا تھوڑا پیسہ جمع تو ہونے سے رہا خرچ ہو جائے گا اور جب پیسہ بینک میں پڑا رہے گا تو جمع ہو کر کسی کام ہی آئے گا کم از کم اس طرح تمثال کو بھی اپنے حصّے کی خطیر رقم یک مشت ملے گی، تو وہ اس سے کوئی کام کر سکتا ہے، جیسے اب اُن کے کلینک کا مسئلہ تھا۔ وہ اس رقم سے بڑی آسانی سے حل ہو سکتا تھا حالانکہ ریاض صاحب نواب بھی مطلوبہ رقم دینے کے لیے بضد تھے۔ تمثال خود ہی ٹال رہے تھے۔ وہ اپنے ماموں سے مزید رقم لینے کے حق میں نہیں تھے۔ اب تک وہ ان کی پرورش اور تعلیم پر کافی پیسہ خرچ کر چکے تھے۔ اس لیے تمثال ان پر اب کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ آخر ان کے اپنے بھی تو دو بیٹے تھے، جن کے مستقبل کے لیے انھیں کچھ نہ کچھ کرنا تھا بلکہ اب تو وہ اس لائق ہو گئے تھے کہ ماموں کی ذمے داریوں میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔

تمثال ایک دن پھر لال کوٹھی گئے۔ اس بار اُن کا ارادہ چچا سے ملنے کے لیے گاؤں جانے کا تھا۔ اتوار کا دن تھا اور ان کا پروگرام تھا کہ عباد کو ہمراہ لے کر گاؤں جائیں گے اور شام تک واپس آجائیں گے۔ شومیٔ قسمت کہ آج بھی ان کی مڈبھیڑ پہلے شمائل ہی سے ہوئی وہ اپنے رہائشی حصّے سے نکل کر کوٹھی میں جا رہی تھی کہ تمثال نے پورٹیکو میں گاڑی روکی اور باہر نکل کر اسے خندہ پیشانی سے سلام کیا اس نے بھی طوعاً و کرہاً ان کے سلام کا جواب دے دیا۔ اس کی بیزاری بلکہ ناگواری محسوس کر کے تمثال بہت خفیف ہوئے اور جلدی سے اندر چلے گئے۔ شمائل کو بھی اندر ہی جانا تھا بیچ میں اچانک وہ ٹپک پڑے تو اس نے اپنی چال مدہم کرلی اور ان کے بعد ہی اندر داخل ہوئی اور سیدھی کچن میں پہنچ گئی۔

بیگم انھیں دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ عباد بھی اس وقت ماں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور ان کا تمثال سے غائبانہ تعارف بھی ہو چکا تھا۔ دونوں بھائی بہت محبت سے گلے ملے۔

"عباد میاں! ماشاءاللہ تم تو بہت بڑے ہو گئے۔ میں تو تمہیں بالکل ننھا منّا سا چھوڑ کر گیا تھا۔ بہر حال تم سے مل کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔"

تمثال نے اپنا بڑا پن برقرار رکھا۔ بیگم نے ان کی خیریت پوچھی اور ہنس کر کہنے لگیں۔

"تمثال بیٹے عابی تو تم سے ملنے کے لیے سخت بے چین تھا۔ اگر آج بھی تم نہ آتے تو یہ تلاش کرتا ہوا خود ہی پہنچ جاتا۔"

"میں نے بھی سوچا کہ آج اتوار ہے ماسٹر عباد گھر پر ضرور ملیں گے۔"

"بھائی جان! مجھے تو یہ سوچ سوچ کر حیرت ہو رہی تھی کہ اچانک اللہ میاں نے اتنا اچھا بھائی کیسے دے دیا؟ یقیناً یہ سب میری نیکیوں کا ثمر ہے۔"

"آپ کی محبت سر آنکھوں پر لیکن کیا تم آج فری ہو۔ دراصل میں تمہارا تھوڑا سا وقت لینا چاہتا ہوں۔"

"کہیے بھائی جان! اتنے تکلّف کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں چچا جان سے ملنے کے لیے گاؤں جانا چاہتا ہوں۔"

"ضرور چلیے، ابّو تو آپ کو اچانک دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

"مجھے بھی اُن کی قدم بوسی کا بے حد اشتیاق ہے۔" تمثال نے بے حد جذباتی لہجے میں کہا۔ عابی کو اپنا یہ چچا زاد بھائی بہت پسند آیا۔

"عابی بیٹا! کسی سے کہہ کر بھائی کے لیے چائے وغیرہ منگواؤ۔"

"جی بہتر۔ میں ابھی آپو جان سے فرسٹ کلاس چائے کے لیے کہتا ہوں۔" عابی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"عابی ماسٹر! اس وقت کافی ٹھیک رہے گی۔" تمثال نے بے تکلفی سے کہا اور کیوں نہ کہتا۔ شمائل کو آتے جو دیکھ لیا تھا وہ تو یہ سمجھ کر آئی تھی مہمان کمرے میں بیٹھا ہوگا اور وہ چپ چاپ ناشتے کی ٹرے ملازم کے ہاتھ بھجوا دے گی۔ یہ کیا معلوم تھا کہ وہ برآمدے میں سامنے ہی براجمان ہوگا اور فرمائش کر کر کے خاطر کروا رہا ہوگا۔ وہ تپ کر رہ گئی، لیکن چپ چاپ کچن کی طرف بڑھ گئی۔ عابی لپک کر اس کے پیچھے کچن میں داخل

ہوگیا۔

"آپو۔ وہ تمثال بھائی کافی کے لیے کہہ رہے ہیں۔"

"سن لیا ہے توبہ کیسے کیسے بے تکلف لوگ آجاتے ہیں۔"

"ارے بھئی وہ لوگ نہیں ہیں میرے بھائی ہیں بالکل سگے چچا زاد بھائی۔" عابی نے گویا تمثال کی اہمیت بتائی۔

"ہاں ہاں جانتی ہوں بابا۔ اب تم جاکر ان کے پاس بیٹھو میں کافی بھجواتی ہوں۔"

"تھینک یو آپو جانی۔" عباد ہنستا ہوا چلا گیا۔

"شمائل کافی کی ٹرے بھجوا کر چلی گئی۔ اور اپنی طرف جاکر پڑھنے بیٹھ گئی۔ لیکن اس کا خیال رہ رہ کر تمثال کی طرف چلا جاتا تھا۔ یہ بات تو اُسے بہت دیر میں یاد آئی تھی کہ وہ اس کے چچا زاد بھائی تھے یعنی اس کے حقیقی چچا کے بیٹے۔ انھیں غیر سمجھنے کی اداکاری تو کی جاسکتی تھی، لیکن انھیں غیر سمجھنا بالکل غیر فطری سی بات تھی۔ ان کا اس سے خونی رشتہ تھا۔ وہ اس رشتے سے لاعلم تھے، لاعلم ہیں اور شاید ہمیشہ ہی رہیں، لیکن وہ اس حقیقت سے کیسے انحراف کر سکتی ہے، لیکن اظہار بھی تو نہیں کر سکتی۔ کیسی کیسی مشکلیں ہیں وہ کیسے ان ساری مشکلات سے باہر نکلے گی۔ کب ایسا وقت آئے گا جب وہ خود کو ایک عام اور نارمل لڑکی سمجھنے کے قابل ہوسکے گی۔ کب؟ آخر کب؟ اور اس وقت بہت دنوں کے بعد اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ کوئی آہٹ محسوس کرکے وہ آنکھیں موند کر سوتی بن گئی۔

"آپو جانی! کیا سوگئیں؟" عباد نے دھیرے سے پکارا۔ وہ خاموش اور بالکل ساکت پڑی رہی۔ عباد دبے پاؤں واپس چلا گیا اور ایک ٹھنڈی سانس اس کے ہونٹوں سے باہر آگئی۔

"عابی! شانو کیا کررہی ہے ذرا اُسے بلا کر لاؤ؟" بیگم نے اسے اکیلے آتے دیکھ کر کہا۔

"امی، وہ تو سو رہی ہیں۔"

"بے چاری تھک بھی تو بہت جاتی ہے جب ہی تو بے وقت سوگئی۔ خیر اسے آرام کرنے دو۔"

بیگم نے کھوئے سے بنی گھر کی مٹھائی تمثال کے سامنے رکھتی، لیکن پہلا پیس عباد نے اٹھا لیا۔ تمثال ہنس دیے۔

"بھائی جان آپ یہیں کیوں نہیں رہتے۔ امی بتا رہی تھیں کہ آپ میڈیکل کالج سے ملے بنگلے میں رہیں گے۔؟"

"فی الحال تو وہیں ہوں۔ اگر ٹھیک نہ لگا تو یہیں آجاؤں گا۔"

"خدا کرے آپ کو وہاں ذرا اچھا نہ لگے۔"

"عابی! میرے بھائی، میں یہاں رہ کر خود بھی تم سب سے دور نہیں رہ سکتا۔ روز نہ سہی دو ایک دن بیچ تو ضرور آؤں گا۔"

"پھر بھی وہ بات کہاں؟ جو آپ کے یہاں رہنے میں ہے۔" عباد کی محبت نے ان پر بہت اثر کیا۔ اتنا اچھا بھائی پاکر وہ بہت خوش تھے۔ ان کا خاندان یوں تو بہت وسیع تھا لیکن کسی سے ملنا جلنا نہیں تھا۔ اب تمثال ملے تو گویا انھیں دولت مل گئی۔ ان کا بس نہ تھا کہ ابھی جاکر بھائی کا سامان اٹھا لائیں۔ عباد چپ ہوگئے اور ان کی خاموشی کو تمثال نے محسوس کیا تو وہ دلجوئی میں لگ گئے۔ انھیں خود بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ ماں جیسی چچی اور چھوٹے بھائی کے خلوص اور محبت کا جواب انکار میں دیں۔ ماموں ممانی نے انھیں ہمیشہ باپ اور ماں کا پیار دیا۔ بھائی بہن بھی سب انھیں بہت چاہتے تھے۔ لیکن یہ لوگ بھی تو غیر نہیں تھے۔ باپ کے رشتے دار تھے بالکل سگا رشتہ تھا۔ خون کا تعلق تھا۔ اس لیے ان کا دل قدرتی طور سے ان کی طرف کھنچ رہا تھا۔

ادھر ادھر کی باتوں کے درمیان ناشتہ ختم ہوا اور تمثال نے چچی سے اجازت مانگی۔

"جاؤ بیٹا خدا حافظ، واپسی میں یہیں آجانا اور کھانا کھا کر ہی جانا۔ میں انتظار کروں گی۔"

"جی بہتر ہے۔" تمثال نے سعادت مندی سے کہا۔

"امی! آپ میری آپو سے بتا دیجیے گا کہ میں شام تک گاؤں سے واپس آجاؤں گا۔"

"کہہ دوں گی۔"

"کیا تم اپنی آپو سے ڈرتے ہو؟" تمثال نے چھیڑا۔

"جی ہاں بہت ڈرتا ہوں۔ دراصل مجھ سے ان کی ناراضگی برداشت نہیں ہوتی۔ اب آپ کا دل چاہے اُسے محبت کہہ لیں اور دل چاہے تو ڈر کہہ لیں۔" عباد نے ہنس کر کہا اور دونوں لڑکے بیگم کو سلام کرکے باہر چلے گئے۔

"یہ آپ کی آپو بد دماغ تو نہیں ہیں۔"

"نہیں بھائی جان۔ وہ تو بہت خوش اخلاق اور خوش مزاج ہیں۔" عباد نے فوراً شمائل کا دفاع کیا۔

"لیکن میرا مشاہدہ تو اس کے برعکس ہے۔" دراصل وہ جلدی کسی سے فری نہیں ہوتیں۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔ اب تو میرا زیادہ وقت یہیں گزرے گا۔ دیکھیں گے تمہاری بات کہاں تک سچ ہے۔"

"آپ انھیں ہمیشہ شائستہ اور بااخلاق پائیں گے۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" تمثال نے بے یقینی سے کہا۔ اور گاڑی اسٹارٹ کرکے گاؤں جانے والے راستے پر ڈال دی۔

شام کے قریب تمثال اور عباد گاؤں سے واپس آئے اور تمثال نے چچی کو سارے دن کی رپورٹ دی۔ کھانا کھایا اور واپس چلے گئے۔ عباد نے کھانے کے بعد ماں کے کمرے میں ہی ڈیرہ جمایا۔ بیگم نے بہت اشتیاق سے پوچھا۔

"تمہارے ابو تمثال سے مل کر خوش ہوئے؟"

"بہت خوش ہوئے۔ میں نے تو آج پہلی بار ابو کو روتے دیکھا۔ سچ امی وہ تو بھائی

جان کو گلے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ ابّو جیسا با اصول اور سخت دل انسان اور یوں آنسو بہائے۔"

"بیٹا! خون کی محبت نے جوش مارا اپنے مرحوم چھوٹے بھائی کی نشانی کو دیکھ کر جذبات پر قابو نہیں رہا۔ پھر اتنے برسوں کے بعد اچانک بھتیجے کو دیکھا تو دل امڈ آیا۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔"

"ابّو نے بھائی جان کو آمدنی کا حساب بتایا تو وہ بہت شرمندہ ہوئے کہنے لگے۔

"چچا جان! برسوں کے بعد میں آپ سے آمدنی کا حساب کتاب لینے نہیں آیا ہوں بس آپ سلامت رہیں میرے لیے اس سے بڑی دولت اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ کا سایہ میرے سر پر رہتی دنیا تک قائم رہے۔ یہ سب کچھ عباد کا ہے آخر وہ بھی تو میرا بھائی ہے۔ میرا بھی فرض ہے کہ اپنے چھوٹے بھائی کا خیال کروں۔ آخر آپ نے بھی تو اپنے چھوٹے بھائی کا خیال کیا کہ اُن کے بعد ان کی اولاد کے لیے ایک ایک پائی جوڑ کر رکھی۔ اب مجھے بھی اپنا فرض ادا کرنے دیجیے۔"

ابّو نے اس وقت تو بھائی جان سے جرح بحث نہیں کی بلکہ یوں کہیے کہ بڑا لحاظ کیا۔ لیکن اُن کا ارادہ تو بدلنے سے رہا۔ وہ بھائی جان کو ان کے حصّے کا پیسہ دیے بغیر نہیں مانیں گے۔ چلتے وقت ابّو نے پھر بھائی جان سے کہا کہ "وہ ذاتی کلینک جب چاہے کھول سکتے ہیں۔ اب اس سلسلے میں اپنے ماموں جان کو پریشان نہ کریں۔ اب تک جو کچھ انھوں نے کیا۔ وہ دراصل ہمارا فرض تھا۔"

"یہ بات تمہارے ابّو نے بالکل ٹھیک کہی اگر تمثال یہاں رہتے ہوتے تو وہ ان کی پرورش اور تعلیم کا فرض ادا کرتے۔ جب فائزہ دلہن تمثال کو لے کر اپنے بھائی کے ساتھ گئی ہیں تب تم بس چند ماہ کے تھے۔" بیگم نے گزری باتوں کو یاد کرتے ہوئے کہا اور چونکہ رات زیادہ ہو گئی تھی اس لیے عباد انھیں شب بخیر کہہ کر سونے چلے گئے۔

اس رات بیگم کو اپنی نوزائیدہ بچی یاد آتی رہی۔ اگر وہ ہوتی تو شادی کے لائق ہو چکی ہوتی اور وہ اس کے لیے تمثال جیسے نوجوان کو آنکھ بند کر کے پسند کر لیتیں، لیکن ان کی بیٹی کی قسمت میں تو دربدری اور گمنامی لکھی تھی۔ خدا جانے وہ اجنبی اُسے کہاں لے گیا ہوگا؟ کیسے اس کی پرورش ہی ہوگی؟ ایک راہ چلتا۔ عام سا غریب آدمی بھلا اسے کیا سُکھ دے سکا ہوگا۔ کیا پتہ اسے کہیں بیچ ڈالا ہوگا۔ لوگ بچے چرا کر فروخت بھی تو کر دیتے ہیں۔ کبھی کسی کو اپنے لیے بچے چراتے نہ دیکھا، نہ سنا۔ تھوڑی سی رقم کے واسطے معصوم بچّوں کا سوداگر نا کیسی شرمناک بات ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ شرمناک کام تو ان لوگوں نے کیا۔ وہ بھی ڈاکٹر کے ساتھ اس گھناؤنی سازش میں شامل تھیں۔ براہِ راست نہ سہی بالواسطہ سہی۔ یہ بات تو انھیں خود ہی سمجھ لینا چاہیے تھی کہ ضروری نہیں ہے کہ اس بار بھی مری ہوئی بچی ہی پیدا ہو۔ بلکہ انھوں نے ڈاکٹر نرگس خان سے اپنے دل کی بات کہی بھی تھی تو انھوں نے اطمینان دلایا تھا کہ اگر زندہ بچی پیدا ہوئی تو وہ اس کی پرورش کا مناسب انتظام کر دیں گی۔ اور انھوں نے بچی کا سارا خرچ خود اٹھانے کا وعدہ کیا تھا، لیکن ڈاکٹر اپنے فرض کی ادائیگی اور دوستی نبھانے میں حد سے زیادہ بڑھ گئیں۔ شاید انھیں بھی یہ خوف تھا کہ میں راز فاش نہ کر دوں۔ اسی لیے انھوں نے اُسے نصیبن کے حوالے کر کے کہیں اور بھجوانے کا انتظام کر دیا۔ اُن سے کہہ دیا کہ مری ہوئی بچی پیدا ہوئی ہے" تاکہ مجھے صبر آجائے۔ انھوں نے تو اپنی بچی کی صورت تک نہیں دیکھی تھی اگر وہ بچی اُن کے سامنے آ کر کھڑی ہو جائے اور اُن سے جواب طلب کرے کہ اپنی زندگی اور مستقبل کے تحفّظ کے لیے انھوں نے ایک معصوم جان پر اتنا بڑا ظلم کیوں کیا۔؟ تو وہ کیا جواب دیں گی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اتنی قصوروار ہیں کہ اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دے سکیں گی۔ ماسوا اس کے کہ وہ ہاتھ جوڑ کر اپنی بیٹی سے معافی مانگ لیں۔ اسے اپنے سینے سے لگا کر ندامت کے آنسوؤں سے اس کا وجود بھگو دیں اور سارا ڈر اور خوف بھول کر سردار صاحب سے کہہ دیں کہ یہ بچی اُن کے جگر کا ٹکڑا ہے۔ ان کے جسم کا ہی ایک حصّہ ہے۔ ان کا اپنا خون ہے اور یہ کہ اب وہ اسے کبھی خود سے جدا نہ کریں گی، لیکن پھر عباد کا کیا ہوگا؟ سردار صاحب تو اسے ہرگز قبول نہیں کریں گے اور ان کا عتاب نازل ہوگا، تو ان کے ساتھ عباد بھی لپیٹ میں آئے گا۔ اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ وہ بچی تو خدا جانے کہاں ہوگی۔ وہ فضول کی باتیں سوچ کر اپنے ذہن کو خواہ مخواہ پراگندہ کر رہی ہیں۔ بیگم نہ جانے کتنی رات تک کروٹیں بدلتی رہیں اور نہ جانے کب نیند کی مہربان بانہوں نے انھیں اپنی آغوش میں لے لیا۔

شمائل حسبِ عادت صبح لان میں چہل قدمی کر رہی تھی جب اس نے دور سے تمثال اور عباد کو گیٹ میں داخل ہوتے دیکھا۔ اور وہ اپنی کتابیں لے کر بیٹھ گئی۔ کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے اس نے کنکھیوں سے دیکھا۔ تمثال اور عباد پسینے میں تربتر ہنستے اور باتیں کرتے اس کی طرف آ رہے تھے۔ دونوں جوگنگ کر کے تھک گئے تھے۔ اس سے ذرا فاصلے پر دونوں آکر بیٹھ گئے پھر عباد تو وہیں گھاس پر اطمینان سے لیٹ گیا۔ تمثال نے اسے سلام کیا۔

"السّلام علیکم مس شانو۔"

"وعلیکم السّلام۔" اس کا جواب مختصر تھا۔ عباد نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کتاب لے لی۔ تو اس نے خشمگین نظروں سے اسے دیکھا۔

"سوری مس آج میرا پڑھنے کا موڈ نہیں ہے۔"

عباد نے پانچ سالہ بچے کی طرح تتلا کر بسورتے ہوئے کہا تو شمائل مسکرا دی۔ تمثال بھی اس کی شرارت پر ہنسنے لگے۔

"آپو ذرا چائے پلوا دیں۔ ہم بہت تھک گئے ہیں۔ خدا آپ کا بھلا کرے اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو میلوں کا چکر لگا کر بالکل جان نکل گئی ہے۔"

شمائل سمجھ گئی کہ اب یہاں اس کی پڑھائی ہونا ناممکن ہے۔ اس نے سامان سمیٹا اور جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

"آپو! آپ کہاں چل دیں؟"

"تمہارے واسطے چائے بھجوادوں۔"

"آپ تو کتابیں بھی سمیٹے لیے جا رہی ہیں۔ کیا واپس آنے کا ارادہ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں باز آیا ایسی چائے سے۔"

"عابی ضد نہ کرو مجھے ابھی کالج جانے کی تیاری بھی کرنی ہے۔ دیر ہو گئی تو پہلا پریڈ مس ہو جائے گا۔"

"میں آپ کو اپنی پیاری ہیرو سے چھوڑ دوں گا۔"

"تم کہاں تکلیف کرو گے۔"

سبحان پر نظر پڑتے ہی عباد نے اُسے چائے لانے کا حکم دیا اور شمائل کو خوشامد کر کے روک لیا۔

"پلیز آپو بیٹھیں نا۔ یہ اچھا نہیں لگتا کہ آپ ہمارا ساتھ نہ دیں۔ ایک کپ پلیز آپو۔"

عباد نے اصرار کیا تو وہ بھی بیٹھ گئی۔ مزید انکار بے مروّتی اور بداخلاقی کی حد میں آجاتا اور وہ تمثال کے روبرو اپنی ایسی تصویر پیش نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"بس میں ابھی ایک منٹ میں آیا۔" عباد اٹھ کر اندر بھاگ گیا اور شمائل اس کی حرکت پر سخت جزبز ہوئی کہ خواہ مخواہ یہ شریر لڑکا مجھے یہاں پھنسا گیا۔ اس بے وجہ خاموشی کو تمثال نے ہی توڑا۔

"آپ کس ایر میں ہیں؟"

"بی۔ اے کا پہلا سال ہے۔"

انھوں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی فائل اُٹھالی۔

"شمائل تو بڑا خوبصورت نام ہے پھر یہ شانو کس لیے کہلواتی ہیں آپ؟" انھوں نے فائل پر اس کا نام پڑھ کر کہا۔

"ایک غریب ملازمہ کی بھانجی کا نام شانو ہی مناسب ہے۔ میرا نام تو میرے ابو نے اپنی خوشی سے رکھا تھا۔ سو جو انھیں پسند آیا رکھ لیا۔ غریبوں کے حوصلے اکثر اپنی حیثیت اور اوقات سے زیادہ اُنچا وند کر جاتے ہیں۔"

"آپ نے خود کو اپنی حیثیت کا احساس دلانے کے لیے یہ نام تجویز کیا ہے یا دوسروں کو مغالطہ دینے کے لیے۔؟" تمثال نے ذومعنی بات کہی، لیکن وہ خاموش رہی۔

"اگر میں یہ کہوں کہ ناموں کا انسان کی حیثیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ ان کی سیرت صورت، کردار اور اخلاق سے ہوتا ہے۔ تب آپ کیا کہیں گی۔؟"

"میرا ارادہ آپ سے بحث کرنے کا بالکل نہیں ہے۔ اس لیے اس بات کو یہیں ختم کر دیں۔"

شمائل سمجھ گئی کہ وہ صرف بات بڑھانے کے لیے یہ سب کہہ رہے ہیں اور وہ اُن سے بے تکلف نہیں ہونا چاہتی تھی کیونکہ بظاہر ان کی حیثیتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ہر چند وہ اس کے بھی چچا زاد بھائی تھے لیکن اس حقیقت سے اس کے سوا کوئی اور واقف نہیں تھا۔ ابھی تو اس کی ماں بھی اس کی اصلیت سے ناواقف تھی۔ وہ یہاں آئی تو اسی ارادے سے تھی کہ ماں کے کلیجے سے لگ کر اپنا آپ منوالے گی، لیکن جو کچھ اس نے یہاں آکر دیکھا اور محسوس کیا تھا اس سے اس کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔ اور وہ اپنی ذات سے اس گھر میں کوئی انتشار پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ خدا خدا کر کے اس کی ماں نے بستر چھوڑا تھا اور ایسا اس کی محبت اور خدمت کے سبب ہوا تھا۔ اب ایک نئی بات کہہ کر وہ انھیں کسی جذباتی صدمے سے دوچار نہیں کر سکتی تھی۔ ایک نیا شاک انھیں موت کے منہ میں بھی دھکیل سکتا تھا اور اسے بہر حال اپنی ماں کی زندگی اور صحت زیادہ عزیز تھی۔ اسے وہ خود سے زیادہ مظلوم لگی تھی۔ اب اس پر مزید ظلم ڈھانا کسی طرح مناسب نہیں تھا۔ اس نے عباد پر بھی خصوصی توجہ اسی لیے دی تھی کہ یہ بگڑا ہوا نوجوان راہ راست پر آجائے اور ماں کی خدمت اور محبت میں کوئی کمی نہ کرے۔ شوہر کی بے اعتنائی کا غم اولاد کی سعادت مندی خدمت گزاری اور محبت سے کم ہو جائے گا ورنہ ایک محروم عورت اولاد کی بربادی کا صدمہ برداشت نہیں کر سکے گی اور موت سے پہلے ہی مر جائے گی۔ اس نے یہاں آتے ہوئے سوچا تھا کہ وہ ممتا کی گھنی چھاؤں میں اپنی زندگی گزارے گی اور ماں کے قدموں سے لپٹ کر اپنی گزشتہ زندگی کی ساری محرومیاں بھول جائے گی، لیکن اب اس کا ارادہ بدل گیا تھا اور اس گھر کے سکون کے لیے خاموش رہنے ہی میں اسے عافیت نظر آ رہی تھی۔

البتہ وہ اپنی تعلیم مکمل ہونے تک یہاں ضرور رہنا چاہتی تھی۔ خود کفیل ہونے کے بعد اسے کسی کے سہارے کی ضرورت نہ ہو گی اور وہ جہاں چاہے گی رہ سکے گی۔ ابھی کچھ دن یہاں رہنے کے لیے وہ مجبور تھی، لیکن ہر قدم پر احتیاط کا دامن تھامے رہی تھی اب تمثال کی دلچسپی دیکھ کر وہ اور زیادہ محتاط ہو گئی تھی۔ خود کو تمام کمتر، لاوارث اور بے مایہ ہستی ثابت کرنے ہی میں اس کی عافیت تھی۔ اس کی دو ٹوک بات سن کر تمثال دھیرے سے مسکرائے۔ شاید وہ کچھ اور کہتے کہ عباد آگیا اور شمائل نے اطمینان کی سانس لی۔

"دیکھا آپو جان! میں کتنے کام کا بچہ ہو گیا ہوں۔ اپنے ہاتھ سے آپ لوگوں کے لیے چائے بنا کر لایا ہوں۔ بھائی جان آپ ذرا نزدیک آجائیں اس وقت آپ کی بیڈ ٹی میرے ذمے باقی سارا دن آپ جانیں۔" عباد نے چائے کی ٹرے رکھ کر کہا۔ عباد نے شمائل اور تمثال کو ایک ساتھ مخاطب کیا اور پیالیوں میں چائے انڈیلنے لگا۔ تب ہی سردار صاحب کی گاڑی گیٹ میں داخل ہوئی۔ شمائل نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سردار صاحب گاڑی سے اتر رہے تھے۔ اونچا قد، بھرا بھرا جسم، سُرخ و سپید رنگ، کشادہ پیشانی کے نیچے گھنے ابروؤں تلے بڑی بڑی روشن آنکھیں اور ناک کی ساخت سے اُن کی مستقل مزاجی اور ہونٹوں کے کھنچاؤ سے سرد مہری عیاں تھی آج اس نے اپنے باپ کو بڑے غور سے دیکھا لیکن اس کے دل میں ان کے لیے محبت، عزت اور للک کا نام و نشان تک نہ تھا۔ وہ بس ناقدانہ نظروں سے ان کا جائزہ لے رہی

تھی۔ ایک ایسی شخصیت جو حکم دینے اور اپنا حکم منوانے کے لیے ہی تخلیق ہوئی تھی اور اسی کے حکم کے صدقے میں اسے اپنے گھر اور اپنی ماں سے دور ہونا پڑا تھا، جس نے اس گھر میں اس کے لیے ایک گوشہ تک دینا گوارا نہیں کیا تھا۔ اور اب بھی وہ کون سا ان کی بیٹی بن کر یہاں آئی تھی۔ وہ تو نصیبن کی بھانجی بن کر اس وسیع وعریض کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں غیروں کی طرح اپنے شب و روز کاٹ رہی تھی۔ اُن کی نظروں سے چھپ کر انھیں یعنی اپنے باپ کو دیکھ رہی تھی اور اس کے دل میں درد وکرب کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ کاش! اس دولت مند، سنگ دل اور مغرور انسان کی جگہ بابا ہی اس کا باپ ہوتا یا پھر وہ مرنے سے پہلے اس پر اس حقیقت کا انکشاف نہ کرتا کہ وہ اس کی بیٹی نہیں ہے۔ بابا چپ رہتا تو وہ اس کی بیٹی ہی رہتی اور مزے سے غربت، مفلسی اور گمنامی کی زندگی بسر کر رہی ہوتی نہ کوئی خلش ہوتی نہ دکھ نہ ہی کوئی پچھتاوا کہ اس نے ایسے باپ کے گھر جنم کیوں لیا جس نے اس کی پیدائش سے پہلے ہی اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

عباد اور تمثال، سردار صاحب کی طرف لپکے، اُدھر وہ سب کی نظروں سے بچ کر اپنے کوارٹر کی سمت بڑھ گئی۔

چچا سے سلام ودعا کے تبادلے کے بعد تمثال کو شمائل کا خیال آیا۔ اُس نے مڑ کر دیکھا تو شمائل کہیں نظر نہ آئی اور اس نے سبحان سے جانے کی کشتی اندر لانے کے لیے کہا۔ عباد اپنے ابّو کا سامان اتروا کر ان کے کمرے میں رکھوا رہا تھا۔ وہ سب اطمینان سے بیٹھے تو عباد نے کہا۔

"ابو! اس بار تو آپ ماشاء اللہ جلدی آگئے۔ اس کے لیے میں بھائی جان کا احسان مانوں یا آپ کسی کام سے آئے ہیں۔؟" اس کے لہجے میں چھپی شرارت پر تمثال ہنس دیے۔

"سچ تو یہ ہے کہ میں تمثال ہی کی وجہ سے آیا ہوں۔ اس روز جی بھر کے باتیں نہیں ہو پائیں تھیں، سوچا کہ چند دن گھر پر گزار دوں۔ اور اپنے بیٹے سے باتیں کروں۔"

"چچا جان! یہ آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی۔" تمثال نے خوش ہو کر کہا۔ عباد نے ان کے لیے بھی چائے بنائی اور وہ لوگ باتیں کرتے ہوئے ماضی، حال اور مستقبل کے خوابوں، خیالوں اور تصوّرات میں ڈوبتے ابھرتے رہے۔ ملازموں میں بھاگ دوڑ شروع ہو گئی تھی۔ ذرا دیر میں ناشتہ تیار ہو گیا اور بڑی سی میز پر سارے لوازمات سجا دیے گئے۔ سردار صاحب مُنہ ہاتھ دھو کر آگئے اور تمثال اور عباد کو بھی بلایا۔ تمثال تو بیٹھ گئے لیکن عباد کھڑے رہے۔

"کیا بات ہے عابی! تم ناشتہ نہیں کرو گے؟" سردار صاحب نے پوچھا اور عباد نے گویا ایک نیا انکشاف کیا۔

"آپ لوگ بسم اللہ کریں میں امّی کے ساتھ ناشتہ کروں گا۔"

"کیوں نہ ہم سب اندر چل کر چچی جان کے ساتھ ہی ناشتہ کریں؟" تمثال نے سادگی سے کہا۔ وہ یہاں کے رسم ورواج سے ناواقف تھے اس لیے اپنی دانست میں انھوں نے بہت مناسب بات کہی تھی۔ عباد نے مسکرا کر باپ کو دیکھا۔ پھر تمثال سے کہنے لگے۔

"بھائی جان! ہمارے گھر میں عورت اور مرد کی یکجائی ممنوع ہے بلکہ گھر کی عورت کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ اسے اپنے ساتھ شامل کیا جائے کیوں ابو میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

سردار صاحب اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھے نہ ہی اس کے طنزیہ لہجے پر غور کیا۔ بس اثبات میں سر ہلا کر گویا اس بات کی تائید کی اور فارن ریٹرن بھتیجے کو اپنی خاندانی روایات سے آگاہ کیا۔

"بیٹا! عورت کا مقام گھر کے اندر ہے اور مرد کا ٹھکانہ گھر کے باہر۔ اسی لیے ہمارے گھروں میں مردان خانہ کی تعمیر کی جاتی ہے۔ مرد ہر وقت زنان خانے میں گھسے رہیں یا عورت کو ہر وقت اپنے سروں پر مسلّط رکھیں۔ یہ مردوں کی شان نہیں ہے۔ اس کی شان تو اس میں ہے کہ وہ باہر کے معاملات کو دیکھے اور گھر والوں کی کفالت کا بار اٹھائے۔"

تمثال ابھی یہاں کی بہت سی باتوں سے ناواقف تھے۔ اور خصوصاً چچا کی افتادِ طبع کے متعلق تو بالکل نہیں جانتے تھے۔ اس لیے انھوں نے چچا کی بات پر کسی قسم کا اظہارِ خیال نہیں کیا۔ اور خاموش رہے۔ سردار صاحب نے ان کی پلیٹ میں کئی چیزیں نکالیں تو انھوں نے بےبسی سے عباد کو دیکھ کر سر ہلایا اور شاید اپنی مدد کرنے کا اشارہ بھی کیا۔

"بھائی جان! آپ اطمینان سے ناشتہ کیجئے میں امّی کے پاس جا رہا ہوں وہ میرا انتظار کر رہی ہوں گی اور جب تک میں نہیں جاؤں گا وہ بھوکی بیٹھی رہیں گی۔"

صاف لگ رہا تھا کہ وہ یہ سب باتیں سردار صاحب کو سنانے کے لیے بلکہ انھیں جتانے کے لیے کہہ رہے تھے۔

"کیوں؟ آج سے پہلے بھی تو وہ اکیلی کھاتی تھیں۔ پھر اب یہ نئی ریت کیوں بن گئی؟" سردار صاحب نے ناگواری سے کہا۔ بھتیجے کا لحاظ تھا اس لیے آواز نیچی رہی ورنہ کیا عجب تھا کہ وہ چیخ چیخ کر گھر سر پر اٹھا لیتے لیکن عباد بھی انھیں کا بیٹا تھا منہ پھٹ بے تکلف اور اپنی بات منوانے والا۔ اس کی تربیت خاص انھیں کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی تھی۔ اس نے بھی تمثال کا خیال کیا اور حلیمی سے لیکن قدرے تلخ لہجے میں اپنے چہیتے ابو کی بات کا جواب دیا۔

"ابو معاف کیجئے گا اگر پہلے اس گھر کے ریت ورواج غلط تھے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ انھیں غلطیوں کو رواج دیا جائے اور انھیں سدھارنے کی کبھی کوشش ہی نہ کی جائے۔ مجھے یہ احساس بڑی دیر میں ہوا کہ میری امّی بالکل تنہا ہیں۔ آپ یہاں رہتے نہیں ہیں۔ میں تو یہیں رہتا ہوں پھر بھی ان سے دور رہتا ہوں۔ قریب رہنے کے باوجود ان سے کوئی مطلب نہیں رکھتا۔ کیا یہ بات مناسب ہے کہ وہ شوہر اور اولاد کی موجودگی میں اکیلی، بس نوکروں کے رحم وکرم پر رہیں؟"

"بھیّا تم جا کر چچی جان کے ساتھ ناشتہ کرو۔" تمثال نے گفتگو کو سنجیدہ اور تلخ رخ

اختیار کرتے دیکھ کر عباد کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ عباد دل برداشتہ سے چلے گئے۔
اس کے جانے کے بعد سردار صاحب نے تمثال سے عباد کے رویئے کی گویا شکایت کی۔

"پتہ نہیں آج عابی کو کیا ہو گیا ہے جو ایسی باتیں کر رہا ہے؟"

"میرے خیال میں تو عباد ٹھیک ہی کہہ رہا ہے چچا جان۔ جہاں تک میں نے دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے چچی جان واقعی تنہائی کے سبب اداس رہتی ہیں۔ ان کی صحت بھی اچھی نہیں ہے اور عابی نے یہ بات محسوس کی ہوگی کہ انھیں دوا علاج سے زیادہ آپ سب کی توجہ اور محبت کی ضرورت ہے۔"

"میں نے کب منع کیا ہے کہ ماں کا خیال نہ کرے یا ان کی فکر نہ کرے البتہ یہ ضرور ہے کہ میں نے اسے ماں کے بے جا لاڈ و پیار کا عادی نہیں بننے دیا۔" سردار صاحب نے اپنی صفائی پیش کی۔

"آپ کا فرمانا بھی بجا ہے چچا جان بہر حال ہم سب کا فرض ہے کہ چچی جان کا خیال رکھیں ان کی صحت کی فکر کریں۔ وہ بہت کمزور ہو گئی ہیں۔ میری امی تو مجھ سے الگ رہتی ہیں، لیکن میرے لیے یہی خوش نصیبی کیا کم ہے کہ ان کا سایہ میرے سر پر قائم ہے اور خدا کرے تا قیامت قائم رہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ مجھے ان کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔ ماں اپنے پاس رہے اس کی بات ہی اور ہوتی ہے۔"

سردار صاحب تمثال کی باتیں بہت غور سے سن رہے تھے ان کے لیے یہ باتیں نئی اور انوکھی تھیں۔ خود ان کی پرورش بھی اسی طرز پر ہوئی تھی کہ ماں حویلی کا ٹبر سنبھالتی تھیں اور انا اور کھلائی ان دونوں بھائیوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ ان دونوں بھائیوں کو تو دودھ بھی انا ہی نے پلایا تھا۔ ذرا بڑے ہوئے تو باپ نے اپنے ساتھ زمین جائیداد کے کاموں میں لگا لیا، لیکن یہ نئی پیڑھی کی باتیں ان کی سمجھ سے باہر تھیں ورنہ بھلا اولادوں کی کیا مجال تھی کہ اپنے باپ دادا کی روایات سے اختلاف یا ان کے احکام کی خلاف ورزی کرتے۔ کل تک تو عباد بھی ان کے خیالات سے متفق تھا۔ بلکہ اختلاف کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اچانک اس کے خیالات میں اتنی بڑی تبدیلی حیران کن بھی اور اس کے پیچھے کسی تیسرے فرد کا ہاتھ تھا۔ وہ تیسرا فرد کون ہو سکتا ہے جس نے عباد کو ان کے خلاف بھڑکایا ہے۔ یہ معلوم کرنا ضروری تھا بیگم تو ایسا کرنے سے رہیں از خود وہ اتنی باتیں نہیں سوچ سکتا انھیں عباد کی باتوں سے اختلاف تھا لیکن تمثال زیادہ سنجیدہ زیادہ تعلیم یافتہ اور ذہین تھا۔ لہٰذا اس کی باتیں سنتے ہوئے وہ کچھ قائل سے ہو گئے لیکن اتنا بھی نہیں کہ آنکھیں بند کر کے ان پر عمل بھی کرنے لگتے۔ یعنی سننے کی حد تک کوئی مضائقہ نہیں تھا اور کچھ نہ کچھ جواب بھی دینا تھا سو انھوں نے اتنی ڈھیر ساری باتوں کے جواب میں اتنا کہنا مناسب سمجھا۔

"ڈاکٹر فاروقی کو میں بیگم کے علاج کے سلسلے میں خاص ہدایت دے دوں گا۔ وہ بہت لائق ڈاکٹر ہیں۔"

"اگر کوئی ضرورت ہوئی تو میں خود چچی جان کو اسپتال لے جا کر ان کا مکمل چیک اپ کراؤں گا۔ اب تو میں یہاں موجود ہی ہوں۔ اس لیے فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے بیٹا جیسے مناسب سمجھو ان کا علاج معالجہ کرو۔ میں بھی ان کا دشمن نہیں ہوں۔" سردار صاحب نے بڑی معقولیت کا ثبوت دیا اور ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد تمثال نے ان سے اجازت چاہی۔

"چچا جان! میں اندر جا کر ذرا چچی جان کو سلام کر لوں پھر مجھے اسپتال بھی جانا ہے۔ انشاء اللہ شام کو حاضر ہو جاؤں گا۔"

"ہاں بیٹا سدھارو خدا حافظ، لیکن ذرا جلدی آنے کی کوشش کرنا۔" سردار صاحب نے بڑی محبت سے کہا۔

"ابھی تو آپ چند روز رہیں گے۔؟"

"ارادہ تو یہی ہے بہتر یہ ہوگا کہ تم یہیں چلے آؤ۔ وہاں لاکھ سہولتیں سہی لیکن اپنا گھر پھر اپنا گھر ہوتا ہے، جو آرام تمہیں یہاں ملے گا وہ کہیں اور نہیں ملے گا پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہاں تم اکیلے ہو۔ اسپتال سے واپس آؤ تو ملازموں سے دماغ پچی کرو یہاں تمہاری چچی ہیں، عابی ہے۔ تمہارا بھی دل لگا رہے گا۔"

"آپ درست فرما رہے ہیں۔"

"اور پھر میری تو خواہش ہے کہ تم نوکری دوکری کا جھنجھٹ ختم کر کے اپنا کلینک کھولو ہمارے ہاں کبھی ملازمت کو اچھا نہیں سمجھا گیا۔"

"چچا جان! اس میں اور دوسری ملازمتوں میں بہت فرق ہے۔"

"جیسی تمہاری خوشی ہو کرو، لیکن ہم سے دور نہ رہو۔ بہت دن جدا رہ لیے بیٹا۔ خدا خدا کر کے تو اتنے عرصے کے بعد ہم سے ملے ہو، تو جی نہیں چاہتا کہ ایک پل کے لیے بھی تمہیں نظروں سے اوجھل ہونے دیں۔" سردار صاحب نے کمال شفقت سے کہا۔

تمثال ان کی محبت سے بہت متاثر ہوئے کہنے لگے۔ "چچا جان! میں آپ کے حکم سے باہر نہیں ہوں۔ جیسا آپ چاہیں گے ویسا ہی ہوگا، لیکن اس موضوع پر اطمینان سے بات کریں گے۔"

"ٹھیک ہے، سدھارو، خدا حافظ۔"

تمثال چچا سے رخصت ہو کر اندر گئے چچی سے کچھ دیر باتیں کیں اور ان سے اجازت لے کر جانے لگے۔ تو عابی انھیں رخصت کرنے باہر تک ان کے ساتھ گیا واپس آیا تو دیکھا شمائل امی کے پاس بیٹھی ہے اسے دیکھ کر عباد کے لبوں پر ایک شریر سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"عابی بیٹا تمہارے ابو کیا کر رہے ہیں انھیں دیکھا ہوتا کوئی ضرورت نہ ہو اور تم یہاں بیٹھے ہو۔"

"میں تو اس وقت جان بوجھ کر ان کے سامنے نہیں پڑا اور آپ کہہ رہی ہیں کہ جاؤ بیٹا شیر کی ماند میں گھس کر دیکھ آؤ کہ وہ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے بھلے ہی وہ مجھے اپنا نوالہ ہی کیوں نہ بنا لے، لیکن آپ کی ہمدردی کم نہیں ہوگی۔"

"اوئی۔ خدا نہ کرے کیسا شیر اور کیسی مانند۔ میں نے کب ایسا کہا ہے؟" بیگم نے اس کی بات پر غور نہیں کیا۔ بس چند الفاظ سن کر ہی بھڑک گئیں۔ عباد ہنسنے لگا۔

"آپو، امّی کو پتہ نہیں ہے کہ میں یہاں آنے سے پہلے اپنے پیارے ابّو سے ایک معرکہ سر کر کے آرہا ہوں، وہ تو کہیے کہ بھائی جان کے سامنے ابّو کچھ زیادہ بولے نہیں ورنہ سچ مچ معرکہ ہو جاتا۔"

"بیٹا میں نے تمہیں منع کیا تھا نا کہ اپنے ابّو سے گستاخی نہ کرنا۔" بیگم نے ہولا کر جلدی سے کہا، تو وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ اس وقت عابی بہت خوش تھا۔ شمائل بھی مسکرا رہی تھی۔

"آپو جان اگر ہمارے ابّو کو کبھی یہ پتہ چل گیا کہ اس گھر میں اتنا بڑا انقلاب لانے والی ایک دھان پان سی لڑکی ہے تو وہ کیا کریں گے؟" عباد نے لطف لے کر کہا۔

"جسے تم انقلاب کہہ رہے ہو عابی وہ دراصل حالات کی تبدیلی ہے۔ اگر صاف پانی بھی ایک جگہ ٹھہرا رہے تو سڑ کر بدبو دینے لگتا ہے۔ یہی حال پرانی روایات اور کہنہ اقدار کا ہے۔ زمانہ، وقت اور حالات تبدیلی چاہتے ہیں اور اس گھر کے لیے یہ تبدیلی بہت ضروری ہے اور پھر میں نے کیا کیا ہے؟" شمائل نے اپنی اہمیت کم کرنے کی کوشش کی۔ وہ خود کو نمایاں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ نہ ہی اسے کسی بات کا کریڈٹ لینے کا شوق تھا۔ البتّہ وہ غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہنے کے حق میں تھی۔ حالات سے سمجھوتہ کرنا اور بات ہے اور دوسروں کی یا اپنی غلطیوں سے مفاہمت کرنا اور بات ہے۔

"یہ تو تمہاری انکساری اور اعلیٰ ظرفی ہے بیٹی!" بیگم نے کہا۔ "ورنہ تم نے تو وہ کیا ہے جو میں سترہ اٹھارہ سال میں نہ کر سکی بلکہ یوں کہو کہ سردار صاحب کی زندگی میں شامل ہونے کے بعد سے اب تک نہ کر سکی۔ تم نے مجھے میری خوشیاں واپس کی ہیں۔ میرا بیٹا مجھے لوٹایا ہے، اس گھر کا سکون اور اطمینان تمہارا ہی مرہون منت ہے ورنہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی میرا عابی مجھے واپس ملے گا۔"

"بیگم صاحبہ یہ تو آپ کی محبت ہے جو آپ ایسا کہہ رہی ہیں۔ میرے لیے یہی بہت خوشی کی بات ہے۔" شمائل نے دھیرے سے کہا۔ جی تو چاہ رہا تھا کہہ دے کہ اس گھر کی خوشیاں مجھے عزیز نہ ہوں گی تو اور کسے ہوں گی لیکن وہ رشتوں کی بھول بھلیوں میں نہ خود اُلجھنا چاہتی تھی نہ دوسروں کو الجھانا چاہتی تھی۔ یہ رشتے بہت نازک تھے بڑے حسّاس تھے اور اسے ان سے نباہ کرنا تھا۔

عباد اپنے کالج کے لیے تیار ہونے چلا گیا اور شمائل بھی بیگم سے اجازت لے کر اپنی طرف آگئی۔ اسے بھی کالج جانا تھا۔ نصیبن اس وقت کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ شمائل بڑی دیر سے ان کی یہ کیفیت دیکھ رہی تھی۔ جب نہ رہا گیا تو پوچھ بیٹھی۔

"کیا بات ہے خالہ؟ آپ کچھ فکرمند نظر آرہی ہیں۔؟"

"بیٹی! میں تو تمہارے ہی بارے میں سوچ رہی ہوں۔"

"کیوں؟ مجھے کیا ہوا ہے؟ ٹھیک ٹھاک تو ہوں۔" شمائل نے ہنس کر کہا۔ لیکن ان کی پریشانی کم نہ ہوئی۔

"ایسا کب تک چلے گا بی بی؟"

"کیا کہہ رہی ہیں خالہ؟"

"یہی کہ میں تمہیں دیکھ کر روز مرتی ہوں روز جیتی ہوں۔"

"یہ تو آپ کو اس وقت سوچنا چاہیے تھا جب ڈاکٹر نرگس خاں نے مجھے ٹھکانے لگانے کا فرض آپ کو سونپا تھا۔ اب تو وہ وقت بیت گیا اور اس وقت نہ حالات آپ کے بس میں ہیں نہ میرے اختیار میں۔"

"بی بی اوروں کا حال تو میں نہیں جانتی لیکن میں خود کو کبھی معاف نہ کر سکوں گی۔" نصیبن نے گہرے دکھ سے کہا۔

"خالہ میں آپ کو شرمندہ یا دکھی نہیں کرنا چاہتی، لیکن آپ کی فکر دور کرنا بھی میرے لیے فی الحال مشکل ہی ہے۔ اس لیے آپ بھی صبر سے کام لیں، میں یہاں بہت خوش ہوں میرے لیے تو یہی بہت ہے کہ یہاں مجھے اپنی ماں کی خدمت کرنے کا موقع مل رہا ہے اور میری ماں اور میرا بھائی عابی ہر دم میری نظروں کے سامنے رہتے ہیں۔ مجھ سے محبت کرتے ہیں میرا خیال رکھتے ہیں۔ رہے والد صاحب تو مجھے ان سے کوئی مطلب واسطہ نہیں ہے۔ جب وہ گھر والوں کی خصوصاً میری ماں کی کوئی فکر نہیں کرتے تو میں کیوں اُن کی فکر کروں۔"

"تمہارا دل بہت بڑا ہے بی بی۔ ہم جیسے چھوٹے لوگ اتنا بڑا جگر کہاں سے لائیں کہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی اُف نہ کریں، سب کچھ اپنا ہو، لیکن اسے اپنا نہ کہیں۔" نصیبن واقعی بہت رنجیدہ تھی۔

"خالہ آپ اُداس نہ ہوں ورنہ مجھے بہت رنج ہوگا۔ ایک آپ ہی تو ہیں، جو میری تنہا رازدار اور ہمدرد ہیں۔ آپ نے مجھے سہارا دیا، مجھے اس گھر میں جگہ دی، اپنا سمجھا اوپر سے اتنی چاہت، اتنی فکر جیسے بالکل سگی خالہ ہی ہوں۔" شمائل نے اپنی بانہیں ان کے گلے میں ڈال دیں۔ بے چاری نصیبن صبر تو کیا کرتیں اُلٹا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اور شمائل نے انھیں بڑی مشکل سے چپ کرایا پھر اُن سے ہنسی مذاق کر کے ہنسانے کی کوشش کی جب وہ ذرا سا مسکرائیں تو اُسے اطمینان ہوا اور وہ کالج چلی گئی۔

سردار صاحب کا خاص ملازم جبرو ہمیشہ اُن کے ساتھ آتا تھا اور وہی ان کا سارا کام کرتا تھا، لیکن اس بار وہ اسے گاؤں میں ہی چھوڑ آئے تھے۔ اس لیے عابی نے سبحان کو اُن کی خدمت پر مامور کر دیا تھا۔ دوپہر کا کھانا سردار صاحب کو تنہا کھانا پڑتا تھا کیونکہ عباد اس وقت کالج میں ہوتا تھا۔ انھیں تو کسی کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ وہ تو اکیلے جینے کے عادی تھے۔

سبحان نے کھانا میز پر لگا دیا اور سردار صاحب کو اطلاع دی۔ وہ میز پر آکر بیٹھ گئے اور کھانا شروع کر دیا۔ سبحان ایک کنارے کھڑا رہا۔

"آج کل خانساماں بہت ہوشیار ہو گیا ہے، بہت اچھا کھانا پکانے لگا ہے، ورنہ کمبخت کے ہاتھ کا کھانا کیا ہوتا تھا بس

دواؤں کا مزہ ملتا تھا۔" سردار صاحب نے ہنس کر بڑی خوشدلی سے تعریف کی۔

"صاحب جی! وہ تو اب بھی دوا پکاتا ہے یہ سب تو شانو بی بی نے پکایا ہے۔ ان کے ہاتھ میں بڑی لجّت (لذّت) ہے۔" سبحان نے خوش ہو کر فخریہ بتایا۔ نیا نام سن کر سردار صاحب چونکے۔ ابھی تک تو ایک 'آپو' ہی کا ذکر سنا تھا اب ایک شانو بی بی بھی آگئیں۔

"یہ کیا کوئی نئی ملازمہ رکھی ہے تمہاری بیگم صاحبہ نے؟"

"جی وہ نصیبن بوا کی رشتے دار ہیں۔"

"اپنی بیگم سے کہو کہ اس مردود حرام خور خانساماں کی ہمیشہ کے لیے چھٹی کر دیں اور اسی کو ملازم رکھ لیں۔"

"صاحب جی ہماری بی بی تو کالج میں پڑھتی ہیں وہ کوئی نوکر تھوڑی ہی ہیں۔ بس اپنی خوشی سے کچھ نہ کچھ پکا دیتی ہیں۔ بیگم صاحب تو انھیں بہت چاہتی ہیں۔ انھیں بیٹی بنا لیا ہے۔" سبحان نے مالک کی بات کا برا مان کر کہا۔

"یہ وہی لڑکی تو نہیں ہے جسے عابی کچھ کہتا ہے، ارے بھلا سا نام ہے؟"

"جی مالک چھوٹے صاحب انھیں 'آپو' کہتے ہیں اور ان کا کہنا بھی بہت مانتے ہیں۔ اب تو روجینہ (روزانہ) کالج بھی جاتے ہیں اور خوب جی لگا کر پڑھتے ہیں۔ غصہ کرنا تو بالکل چھوڑ دیا ہے بس یوں جان لیں کہ ہمیں بہت دنوں سے مرغا نہیں بنایا ہے اور نہ ڈانٹتے مارتے ہیں۔"

"اچھا اچھا اب تم میز بڑھاؤ اور حقّہ تازہ کر کے لے آؤ اور ہاں عابی آجائیں تو میرے پاس بھیج دینا۔"

"صاحب جی! چھوٹے صاحب تو شام کو کوجن (کوچنگ) جاتے ہیں اور بہت دیر میں آتے ہیں۔" سبحان نے ایک اور نئی اطلاع دی۔

"ارے کیا یہ لڑکا ہر وقت پڑھتا ہی رہتا ہے؟"

"جی ہاں۔ ہماری بی بی نے کہہ دیا ہے کہ اب کی بار اچھے نمبروں سے پاس ہونا ہے۔" سبحان نے پھر بی بی کا قصیدہ پڑھا۔

"یہ کیا بی بی، بی بی لگا رکھا ہے، چل بھاگ یہاں سے مردود، حقّہ بھر کر لا۔"

سردار صاحب نے چڑ کر اسے ڈانٹ دیا اور وہ اپنی جان لے کر وہاں سے رفو چکر ہوگیا۔ اور جا کر ایک کی اٹھارہ بیگم سے لگا دیں۔

"تو جا ان کا حقّہ بھر کر دے آ۔ اور خبردار عابی سے ایک لفظ نہ کہنا۔ ورنہ تیرے دونوں کان اکھاڑ کر ہاتھ پر رکھ دوں گی۔"

شام کو اسپتال سے فرصت ملتے ہی تمثال 'لال کوٹھی' آگئے۔ وہ چچا سے وعدہ کر کے گئے تھے اور انھیں یہ بھی احساس تھا کہ وہ صرف ان کی خاطر گاؤں سے آئے ہیں۔ دو ہی ملاقاتوں میں وہ خود بھی انھیں بہت چاہنے لگے تھے اسے خون کی کشش ہی کہا جا سکتا ہے حالانکہ وہ ماموں جان کی طرح نہ تو روشن خیال تھے اور نہ ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ غرضیکہ دونوں میں کوئی بھی قدر مشترک نہیں تھی۔

سردار صاحب، تمثال کو دیکھ کر خوش ہو گئے۔ بے چارے اکیلے بیٹھے حقّے سے شغل کر رہے تھے۔ عباد تو کالج سے آنے کے بعد کوچنگ چلا گیا تھا، ورنہ پہلے وہ انھیں کے پاس رہتا تھا۔ اور یہ فرق ایسا نہ تھا جسے وہ محسوس نہ کرتے، لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ اسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے جس اولاد کی گستاخیوں کو وہ دوسروں کے لیے جائز سمجھتے تھے اور خصوصاً ماں کے معاملے میں اس سے کبھی کسی قسم کی باز پرس نہیں کرتے تھے اب بھلا وہ اسے کیا کہتے؟ اس کے پاس تو ان کے ہر سوال کا جواب موجود تھا سو انھوں نے اس سے جرح یا بحث کرنا فضول سمجھا اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

تمثال نے چچا کی خوشی کے پیش نظر اسپتال سے چھٹی لے لی تھی۔ اس نے خوشی خوشی انھیں بتایا۔

"چچا جان میں نے ہاسپٹل سے چار دن کی چھٹی لے لی ہے تاکہ آپ کے ساتھ زیادہ وقت گزار سکوں۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا بیٹا، ورنہ نوکری سے اتنی فرصت بھلا کہاں ملتی کہ تم میرے پاس بیٹھتے۔" سردار صاحب نے خوش ہو کر کہا۔

"آج ماموں جان کا خط بھی آیا ہے۔ آپ کو سلام لکھا ہے۔"

"سب خیریت تو ہے؟ ریاض صاحب کیسے ہیں؟"

"جی سب اللہ کا کرم ہے۔ ماموں جان اور بھائیوں کا اصرار ہے کہ میں واپس آجاؤں اور وہیں جاب کروں۔"

"محبت کرنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں کوئی اپنے پیاروں کی جدائی برداشت نہیں کرتا، لیکن تم بہت سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کرنا ہماری محبت اپنی جگہ، لیکن تمہیں ساری باتوں سے قطع نظر اپنے مستقبل کی فکر کرنا چاہیے۔"

"آپ درست فرما رہے ہیں فی الحال تو میں یہ ملازمت نہیں چھوڑ سکتا۔ ہاسپٹل بہت اچھا ہے اور یہاں سیکھنے کے مواقع بھی بہت ہیں۔ اس سے فائدہ اٹھانا میرے حق میں بہتر ہی ہوگا۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے بیٹا، لیکن ملازمت کے ساتھ ساتھ اگر تم اپنا کلینک بھی کھول لو تو کیا برا ہے۔ کئی لاکھ روپے تمہارا اپنا بینک میں پڑا ہے۔ اور اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ رقم کم ہوگی تو میں کس لیے ہوں۔ جتنا پیسہ خرچ ہوگا میں دوں گا۔"

"جی بہتر ہے۔" تمثال نے ان سے اتفاق کیا۔ وہ جانتے تھے کہ چچا سے اختلاف کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ انھیں دکھ ہوگا اور وہ انھیں کسی قیمت پر ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔

"تم اپنے ماموں جان سے بھی مشورہ کر لو۔ ورنہ انھیں شکایت ہوگی۔"

"جی ہاں، ان سے بھی مشورہ کروں گا۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تمہارا کلینک وغیرہ جم جائے تو پھر تمہارا گھر بسانے کی فکر کروں یہی عمر ہوتی ہے شادی بیاہ کی۔"

"میں آپ کے حکم سے باہر نہیں ہوں انشاءاللہ جیسا آپ چاہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔" تمثال کی سعادت مندی اور فرمانبرداری

سے سردار صاحب بہت خوش ہوئے۔

"کاش عابی بھی تمہاری طرح سمجھ دار اور سنجیدہ ہوتا۔ مجھے تو شک ہے کہ وہ زندگی میں کبھی لائق ہوگا بھی یا نہیں۔؟"

شاید لائق و فائق بھتیجے کو دیکھ کر انھیں احساس ہوا تھا کہ عباد کی تعلیم اور تربیت میں خامی رہ گئی ہے۔ اس کی اٹھان بہتر نہیں ہے نیز یہ بھی کہ ہر لڑکے کو تمثال جیسا ہونا چاہیے لیکن اس وقت وہ یہ بات بھول گئے کہ تمثال کی تعلیم و تربیت ایک خاص ڈھنگ اور اچھے ماحول میں ہوئی ہے جب کہ عباد کو جو ماحول ملا وہ کسی بھی طرح صحت مند نہیں کہا جا سکتا بلکہ عباد کو بے ڈھنگا بنانے میں خود انھوں نے اہم رول ادا کیا ہے۔ جب بچے کو ماں سے دور رکھا جائے اور اس سے بیٹے کی تربیت اور پرورش کا حق چھین لیا جائے اوپر سے باپ اس کی لگام بھی ڈھیلی چھوڑ دے تو یہی ہوتا ہے اولاد کی پرورش کے لیے والدین کو کڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ بہت سی قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ عباد کو ماں سے کوئی مطلب واسطہ ہی نہیں تھا۔ باپ نے انھیں جیسا بنانا چاہا وہ بن گئے۔ اب پچھتانے سے کیا حاصل ہو سکتا تھا۔ تاہم تمثال نے انھیں تسلی دی۔

"چچا جان! عباد ابھی بچہ ہے۔ وہ بہت اچھا ہے، مخلص، محبت کرنے والا اور رشتوں کا احترام کرنے والا بس تھوڑی سی توجہ اور رہنمائی کی ضرورت ہے پھر آپ دیکھیں گے کہ یہی عباد زندگی میں کامیابیوں کو کس طرح گلے لگاتا ہے۔ انشاء اللہ وہ بہت ترقی کرے گا۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ بہر حال اب تم آ گئے ہو تو یہیں رہو۔ تمہاری صحبت میں وہ بھی سدھر جائے گا۔ اسے یہ بات سمجھانا ضروری ہے کہ تعلیم حاصل کر کے ہی وہ کچھ بن پائے گا ورنہ زمینوں کا انتظام اس کے بس کی بات نہیں ہے۔"

"وقت آنے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اس کا خیال رکھوں گا اور جہاں تک مناسب سمجھوں گا اس کو رائے مشورہ بھی دوں گا اور ضرورت پڑی تو تنبیہہ بھی کروں گا۔"

"ہاں بھئی۔ وہ بات تو بار بار ادھوری رہ جاتی ہے اور کوئی نہ کوئی قصہ نکل آتا ہے۔ بس تم یہیں آ جاؤ۔ اتنی بڑی کوٹھی ہے جہاں پسند کرو اپنے لیے دو تین کمرے درست کروالو۔ تم یہیں رہو گے تو مجھے بھی اطمینان رہے گا۔"

"جی بہت بہتر۔" تمثال نے سعادت مندی سے کہا۔

"چار دن کی چھٹی کر لی ہے تو اس میں یہی کام کر ڈالو۔ سامان کی ضرورت ہو عابی سے کہنا وہ سب انتظام کر دے گا، نئے فرنیچر کی ضرورت ہوگی وہ بھی اپنی پسند سے خرید لینا، جو فرنیچر کمروں میں رکھا ہے وہ سب پرانے وقتوں کا ہے۔ تمہیں پسند نہیں آئے گا۔"

"ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے چچا جان جو سامان اور فرنیچر وغیرہ ہے۔ اسی سے کام چل جائے گا اور پھر اب تو پرانے ڈیزائن کا فرنیچر زیادہ پسند کیا جاتا ہے اور لوگ زیادہ قیمت دے کر ایسی نایاب چیزیں خریدتے ہیں۔"

"جیسی تمہاری مرضی میرا مقصد تو بس اتنا ہے کہ تم کسی قسم کی تکلیف نہ اٹھانا اور نہ ہی پیسوں کی فکر کرنا۔ بلا تکلف کہہ دینا میرے پاس جو کچھ ہے وہ تم دونوں بھائیوں کا ہی ہے۔"

"آپ اطمینان رکھیں جب بھی ضرورت ہوگی میں آپ سے ضرور کہوں گا۔" تمثال نے انھیں اطمینان دلایا۔

"اتنے عرصے تک تمہارے ماموں جان نے وہ سارے فرائض ادا کیے جو مجھے ادا کرنے چاہئیں تھے۔ اب انھیں پریشان نہ کرنا۔"

"جی میں سمجھتا ہوں۔"

رات کا کھانا تمثال نے سردار صاحب کے ساتھ ہی کھایا اور عباد نے حسبِ معمول اپنی امی کا ساتھ دیا۔ اور پھر تھوڑی دیر دونوں بھائی گپ شپ کرتے رہے۔ پھر تمثال سب سے اجازت لے کر چلے گئے۔ عباد نے روکا بھی لیکن انھوں نے معذرت کر لی کہ وہ اپنے ملازموں کو بتا کر نہیں آئے ہیں ورنہ رک جاتے۔

دوسرے دن تمثال کچھ ضروری کام نپٹا کر لال کوٹھی گئے تو دیکھا کاریگر اور مزدور کام میں مصروف ہیں اور سردار صاحب ان کے سر پر کھڑے اپنی نگرانی میں کام کروا رہے ہیں۔ انھیں دیکھ کر سردار صاحب نے مسرور لہجے میں کہا۔

"تمثال بیٹا، میں نے سوچا کہ تم نے چھٹی لی ہے تو اسے ضائع نہ کرنا چاہیے۔ اب تم اپنی مرضی سے اپنے لیے یہ دونوں کمرے درست کرا لو۔ فی الحال تھوڑی بہت مرمت اور پتائی میں کرائے دے رہا ہوں۔ اس کے بعد تم اور عابی دیکھنا۔"

"چچا جان۔ آپ نے کیوں زحمت کی۔ آخر ہم لوگ کس لیے ہیں؟" تمثال کو بڑی شرمندگی ہو رہی تھی۔

جاری

بقیہ: انگلیاں فگار اپنی

جو لمبے بھی ہوتے ہیں لیکن ان ہاتھوں میں انگلیاں نہیں ہوتیں۔ پہلے ان ہاتھوں کی ساری رگیں گویا رگِ جاں تھیں اب تو قانون کے کبھی دائیں اور کبھی بائیں ہاتھ پر لوگ اپنی انگلیاں رکھ کر اس کی نبض ٹٹولتے ہیں اور یہ ملتی نہیں ہے۔ پہلے یہ نبض خودکار تھی یہ از کار رفتہ تو نہیں ہو گئی ہے لیکن اب یہ ریموٹ کنٹرول کے تابع ہے اور اس ریموٹ پر گرفت ان انگلیوں کی ہے جن کے نشانات کسی کاغذ پر نہیں ہیں۔

انگلیوں کے معاملے میں انگریز بہت حساس بلکہ رقیق القلب واقع ہوئے ہیں۔ ترکاریوں کے ناموں میں بھی خواتین کا پورا خیال رکھتے ہیں اور بھنڈی کو نسوانی انگلیاں (لیڈیز فنگرس) کہتے ہیں۔ اقبال کو شکایت تھی تو ہند کے شاعروں، مصوروں افسانہ نویسوں سے کہ ان کے اعصاب پر عورتوں کا تسلط ہے انھوں نے گو کہ وہ کافی عرصہ بلادِ یورپ میں رہے، انگریزوں کے اعصاب کا مطالعہ نہیں کیا۔ ان کے یہاں تو ایک پودا بھی ہوتا ہے جس کا نام انھوں نے مدرانِ لاز ٹنگ رکھ چھوڑا ہے۔ اس پودے کے پتے کارِ جہاں کی طرح دراز ہوتے ہیں ایک نام میں ذہانت اور دوسرے میں ظرافت۔

اس مضمون کا انتساب سوچتا ہوں ترکاری کے نام کروں یا پودے کے نام۔

میں کیوں اُداس ہوں

عظیم اقبال

گنج ۱، بتیا ۸۴۵۴۳۸، بہار

برادرِ محترم ! آداب و نیاز

ایک افسانہ بعنوان "میں کیوں اداس ہوں؟ پیش خدمت ہے۔ امید ہے کہ اُسے شرفِ قبولیت بخشیں گے۔

"بیسویں صدی میں نئی تبدیلیاں لائقِ ستائش ہیں۔

خدا کرے آپ بہ عافیت ہوں۔

خلوص کار
عظیم اقبال

اُس دن ایسا لگتا تھا کہ جیسے آفتاب سوا نیزے پر آٹکا ہو۔

دھوپ تپ رہی تھی اور ہوا بے رفتار تھی۔ حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے اور جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ امّاں کی بات نہ ہوتی تو میں باہر نکلتی ہی نہیں۔ باندھنے کی حد تک دوپٹہ میں نے سر پر لپیٹ لیا تھا اور اس کے سرے کھینچ کر دانتوں تلے دبا لیے تھے۔

نوری صاحب کی رہائش گاہ اس گلی میں تھی جس میں ہمارے مکان کا عقبی دروازہ کھلتا تھا۔ میرے پردہ ہٹاتے ہی نوری صاحب کی آواز ابھری تھی۔

"کون ہے؟"

جواباً 'آداب عرض!' کہتے ہوئے میں سامنے آ گئی تھی۔ ان کے مزید استفسار سے پہلے ہی میں نے اپنے آنے کا مدعا بھی بیان کر دیا تھا۔

میری بات سنتے ہوئے مجھے سر سے پیر تک وہ دیکھے جا رہے تھے۔ شاید سوچ رہے ہوں کہ میں نے کیا حُلیہ بنا رکھا ہے۔

وہ خود آدھے دھڑ سے بے لباس تھے۔ اُن کے جسم کا باقی حصّہ بھی زیادہ تر کھلا ہوا تھا۔ ان کے تمام بدن پر سیاہ گھنے بال تھے۔

پنکھا ہلاتے اور پان چباتے ہوئے انھوں نے پوچھا تھا۔

"کون سی کتاب چاہیئے؟"

اماں نے کوئی تفصیل تو بتائی نہ تھی صرف اتنا ہی کہا تھا۔

"ایک کتاب مانگ لاؤ۔"

جب میں نے اماں کی بات دہرائی تو وہ مسکرائے۔

اب یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ ان کا مسکرانا مجھے بھلا لگا تھا یا بُرا، البتہ جب مسکراتے ہوئے اُن کا منہ ذرا ذرا کھلا تھا اور اُن کے کوئلے جیسے کالے دانتوں کی نمائش ہوئی تھی تو میری نظریں خود بخود اِدھر اُدھر ہونے لگی تھیں۔

سنا تھا کہ نوری صاحب شاعر ہیں۔ ویسے رشتے کے نام پر ہمارا ان سے کوئی تعلق نہ تھا، لیکن چونکہ اماں انھیں بھیّا کہتی تھیں، ہم سب بھی انھیں ماموں کہنے لگے تھے۔

اُن سے ایسے مراسم ہو گئے تھے کہ جس سے ہماری طرف آنے جانے کے لیے کسی موقع محل کی پاس داری ضروری نہیں تھی گھر کا ہر چھوٹا، بڑا ان کی عزت کرتا تھا۔ گھر آنے پر اُن کی خاطر تواضع کا خیال رکھا جاتا تھا۔ جب گھر میں کوئی خاص چیز پکائی جاتی تو نوری صاحب کے حصّے کی طشت انھیں ضرور بھیجی جاتی۔ ہماری کوئی تقریب مختصر اور محدود ہوتی تب بھی انھیں بلایا جاتا۔

یہ سوچنا کہ بھری پُری دنیا میں اُن کا کوئی نہیں بڑا عجیب لگتا تھا۔ ایسا کیونکر ہو سکتا ہے کہ آدمی کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو! بتائیے تو کہ ایسے آدمی کے لیے دل میں بھلا کون سا جذبہ ابھرے گا۔

نوری صاحب کی شاعری کی کتاب چھپی تھی تو ہمارے گھر پر جشن ہوا تھا۔ دور و نزدیک کے شاعر اکٹھے ہوئے تھے اور انھیں مبارکباد دی تھی۔ ان کے گلے میں رنگ برنگے پھولوں کے اتنے سارے ہار پہنائے گئے تھے کہ ان کا چہرہ چھپ گیا تھا۔ اس موقع کی تصویریں اُتاری گئی تھیں، ویڈیو فلم بنائی گئی تھی۔

کیمرے کے بدلتے زاویے اور چمک کے ساتھ لوگ اُن کے قریب تر ہوتے جاتے تھے۔

جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں تھیں۔

"نوری صاحب نوشاہ بن گئے۔"

"قدردانی تو شایانِ شان ہوئی!"

"چلو بیچارے کے ارمان پورے ہوئے!"

"کوئی ان کا اپنا ہوتا تو آج پھولا نہ سماتا!"

"ایسی عزت تو قسمت سے ملتی ہے!"

تقریریں ہوئیں، مشاعرہ ہوا۔ فجر کی اذان ہوئی تو جلسہ ختم ہوا۔

نوری صاحب طرح طرح کے رسالے منگاتے تھے۔ قصے کہانیوں کی کتابوں کا بھی اُن کے پاس ذخیرہ تھا۔ رسالے اور کتابیں فروخت کرنے کے بجائے وہ انھیں کرایے پر چلاتے تھے۔

امّاں کے لیے کتاب لانے کا یہ پہلا موقع تھا۔ تابش کے سر میں درد نہ ہوتا تو شاید مجھے نہ بھیجتیں۔

نوری صاحب نے اپنا چشمہ اُتارا اپنی گود میں پڑی ہوئی کتاب بغل کی تپائی پر رکھی، میری ہتھیلی تھامی اور مسکرانے لگے ایک بار پھر اُن کے بند ہونٹ کھلے تو ان کے کالے دانتوں کی جھلک دکھائی دی۔ جانے کیوں اس بار میں نے اپنی نظریں نہ جھکائیں لیکن انھوں نے جس جھٹکے سے مجھے اپنی طرف کھینچا تھا۔ اس سے زیادہ تیز جھٹکے سے میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا تھا اور جانے کے لیے مڑ گئی تھی۔

وہ مجھے آوازیں دے رہے تھے لیکن میں نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا وہاں پہلے کی سُست روی اب تیز روی میں بدل چکی تھی۔

گھر کی دہلیز تک پہنچتے پہنچتے میں باقاعدہ ہانپنے لگی تھی۔ امّاں کا سامنا ہونے تک میں نے حواس یکجا کر لیے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں چھپے سوال کے جواب میں، میں صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

"نوری صاحب گھر پر نہیں ہیں۔"

آج تک یہ نہیں سمجھ پائی ہوں کہ یہ جھوٹ میں نے دانستہ بولا تھا یا غیر دانستہ۔ اس جھوٹ کی مجھے ضرورت ہی کیا تھی؟ اگر میں سچ کہہ دیتی تو کیا ہوتا؟ اماں میرا یقین کرتیں؟

اماں اور میرے درمیان جو فاصلہ تھا، اسے میں کبھی طے نہ کر پائی۔

امّاں کی تفریح کے لیے کتابیں لانے میں پھر کبھی نہ گئی۔

برسوں بعد، میرے بیاہ کے وقت میری رخصتی کی گھڑی آئی اور میرے اپنے مجھ سے لپٹ لپٹ کر روتے رہے تو نوری صاحب بھی میرے قریب آئے تھے، لیکن جانے کس جذبے کے تحت برق رفتاری سے پلٹ کر میں امّاں کے گلے میں جھول گئی تھی اور ادرگرد ابھری سسکیوں کے درمیان میرے رونے کی آواز نمایاں ہو گئی تھی۔

تاجدار سے مجھے محبت سے زیادہ شفقت ملی میری کوتاہیوں درگزر کیں، میری غلطیوں پر ہنس دیے، اپنی کمیوں پر پشیمان ہوئی تو بانہوں میں بھر کر میری پیٹھ تھپتھپائی۔ گویا کہ شاباشی دے رہے ہوں۔ ندامت سے ایسے گھڑی کہ آنسو تک نکل آتے۔

میری خواہ مخواہ کی سنجیدگی، اُن کی بشاشت سے مزاحمت میں ہمیشہ پیش پیش رہی۔ وہ ہر بات میں ہنسی کا پہلو ڈھونڈ لیتے میں ہنسی کی بات میں بھی کھوئی کھوئی رہی۔ میری خاموشی انھیں ناگوار لگی تو اُن کے قہقہوں سے میں چڑ گئی۔ ہماری مفاہمت یہیں نہیں ہو پائی۔ میں انھیں ہنسنے سے باز رکھنا چاہتی تھی لیکن یہ میں کیسے کہہ پاتی کہ یہ ہنسی میرے ذہن پر ضرب لگاتی تھی، میری نسیں تن جاتی تھیں ایسی تپش کا احساس ہوتا تھا کہ جیسے آندھیاں اُٹھنے والی ہوں! اُف! کھلے کھلے ہونٹوں کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے وہ کالے کالے دانت میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ رہے تھے؟ بالوں سے ڈھکے ہاتھ کی گرفت کب تک محسوس کرتی؟ اپنی اس چشم پوشی کو کیا کہوں کہ تاجدار کے دانتوں پر کوئی میل تھا نہ اس کے اعضا کالے گھنے بالوں سے آراستہ تھے۔

ان دنوں جب کہ میں اُمید سے تھی، میری اُداسی، سراسیمگی میں بدلی ہوئی تھی۔ ناگہانی موت کے تصور نے مجھے بے حال بنا رکھا تھا۔ پہلی بار میری پژمردگی تاجدار کے اضمحلال کا باعث بنی تھی۔

اس رات جس کے مہیب اندھیروں نے اپنی چمکتی صبح کی کرنوں کے ساتھ، اُفق کی پہلی چیخ سنی تھی، تاجدار نے سارا وقت میرے پہلو میں بیٹھ کر گزار دیا تھا۔ لمحہ لمحہ مجھے دلاسا دیا تھا۔ میری ہمت بڑھائی تھی، منتیں مانگی تھیں دعائیں کی تھیں۔

اُفق کو پا کر مجھ سے زیادہ تاجدار خوش ہوئے۔ میری سلامتی کی خبر سُن کر تو بے اختیار رو دیے۔ یہ سب میں نے جانا تو میری آنکھیں بھی چھلکنے کے لیے مچل اٹھیں۔

شروع دنوں میں ہی تاجدار نے مجھ سے کہا تھا۔

"مجھے صرف ایک بیٹی چاہیے۔"

اُفق کے بعد انھوں نے مزید کچھ نہیں چاہا۔

ادھر اُدھر سرگوشیاں سُنیں تو سہی لیکن اَن سُنی کرنا جانتے تھے۔ مجھے بھی یہی سکھایا۔

"یہ سب ایسے سُن کر جیسے سُنا ہی نہیں۔"

ایک دن انھیں کے گھرانے کی ایک بڑی بی نے اپنی بزرگی کے ناطے کچھ اُلٹی سیدھی باتیں کیں تو وہ ضبط نہ کر سکے۔

"یہ آپ کیسی عورت ہیں جو چاہتی ہیں کہ آپ سب کی خوشی کے لیے میں ان کی زندگی کو ایک بار پھر داؤں پر لگا دوں؟"

بڑی بی لہجہ پہچانتی تھیں زبان درازی کے لیے پھر آمادہ نہ ہوئیں۔

اُفق میں پہلے تو میری شبیہ ابھری، لیکن پھر تاجدار کے نقوش بھی اُجاگر ہونے لگے۔ اس کی آنکھوں پر میری آنکھوں کی شباہت تھی تو اس کی پیشانی تاجدار کی پیشانی پر گئی تھی۔ اس کی ناک، میری ناک جیسی تھی تو اُس کے ہونٹوں پر تاجدار کے ہونٹوں کا گمان ہوتا تھا۔ اس کی آواز میری آواز سے مشابہ تھی تو اس کے اطوار پر تاجدار کا اثر تھا۔

اُفق کی تاجدار سے وابستگی فطری اس لیے کہی جاتی کہ بیٹیاں، باپ سے زیادہ مانوس ہوتی ہیں۔

اُفق کی وجہ سے تاجدار کے جتنے کپڑے خراب ہوئے شاید اُتنے میرے نہیں ہوئے ہوں گے۔ راتوں کو بے پروائی سے میں تو سوتی تھی، لیکن وہ اُٹھ اُٹھ کر اُس کی خبر گیری

باقی صفحہ ۷۲ پر

غزلیں

مُصوّرؔ سبزواری
پوسٹ آفس نوح، گوڑ گاؤں، ہریانہ ۱۲۲۱۰۷

شب کے انفاس میں خوشبو سا اُترتا ہے وہی
پھول سا میرے خرابے میں بکھرتا ہے وہی

رات بھر رہتی ہے بے لمس سی ہم آغوشی
صبح بستر سے مرے ساتھ اترتا ہے وہی

آمد و رفت ہے سانسوں کی اسی کے بس میں
مجھ میں جیتا ہے وہی اور کبھی مرتا ہے وہی

وہی اُکساتا ہے پردیس چلے جانے پر
پھر مری لمبی جدائی سے بھی ڈرتا ہے وہی

ایک ہی ہاتھ کے دو نام مسیحا، قاتل
گھاؤ کرتا ہے وہی گھاؤ بھی بھرتا ہے وہی

وہ کوئی اور نہیں ہے جسے پہچان نہ پاؤں
دل کے ایواں میں شب و روز سنورتا ہے وہی

جدا تم سے اِک انجانی خبر پر مجھ کو ہونا ہے
روانہ آسمانوں کے سفر پر مجھ کو ہونا ہے

نہ اب سے ہو سکیں گی جاتے موسم کی مدارا تیں
نہ اب سے پت جھڑوں کی رہ گزر پر مجھ کو ہونا ہے

نہ مجھ میں سرحدیں ڈالو زمینیں بانٹنے والو
میں بارش ہوں ہر اک گلشن کھنڈر پر مجھ کو ہونا ہے

تمہارا کچھ نہیں باقی اب اس اجڑی عمارت میں
میں سناٹا ہوں سب دیوار و در پر مجھ کو ہونا ہے

گلی میں مضمحل جھونکے کی بھی آہٹ نہیں کوئی
وہی اک منتظر خاموش در پر مجھ کو ہونا ہے

ڈرا ڈرا سا بدن انتخاب سب نے کیا
خراشِ سنگ سے اس کو گُلاب سب نے کیا

میں تار تار تھا جیبِ خلوص کی صورت
کہ مجھ کو خرچ یہاں بے حساب سب نے کیا

نہ اِک ضمیر بچا مصلحت کی دلدل سے
یہ کیسا روح پہ نازل عذاب سب نے کیا

بچا کے حُسن کم آمیز لے گیا تم کو
گھُلا مِلا تھا میں مجھ کو خراب سب نے کیا

گرفتِ خواب میں وہ آ نہیں سکا نہ سہی
یہ ایک تجربہ ناکامیاب سب نے کیا

ملے نہ قصرِ ملامت سے آپ کے ہی خطاب
ہمیں ذلیل تو عزّت مآب سب نے کیا

United
UNITED
PRESSURE COOKER
UNITED
GROUP OF INDUSTRIES
مختلف سائزوں میں
یونائیٹڈ ®
پریشر کوکر اور پریشر پان
آپ کے باورچی خانہ میں آپ کے
بھروسہ مند ساتھی .... سالہا سال تک
EPHKE

دستک نہ دو

سیما ناصر

بی۔۵۔ گلبرگ اسکوائر۔ ایف۔ بی۔ ایریا۔ بلاک ۱۶۔ کراچی۔ پاکستان

مکرّمی نیّر بھائی
السّلام علیکم!

سالنامے میں شامل کہانی کے لیے ممنون ہوں۔ ایک اور کہانی "دستک نہ دو" بھجوا رہی ہوں۔ "بیسویں صدی" میرا پسندیدہ رسالہ ہے اور میں صرف اسی کے لیے لکھتی ہوں جیسے ہی کوئی کہانی ہو جاتی ہے فوراً ہی بھجوا دیتی ہوں۔

خدارا مجھے میرے پیارے رسالے سے نہ ترسایا کیجیے۔ اللہ جانے ڈاک والوں کو مجھ سے کیا بیر ہے۔

آپ کی بہن
سیما ناصر

ہوٹل انڈس کے لان پر جگمگاتے قمقموں کی آنکھ مچولی کرتی روشنیوں میں آج بڑا ہی حسین اور تاریخی اجتماع ہے۔

ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری اینڈ ٹورازم کی جانب سے دریائے سندھ کے کنارے اس خوبصورت لان پر ڈنر دیا جا رہا ہے، جس میں دنیا بھر کے مندوبین نے شرکت کی ہے۔ آج یہ سب یہاں اکٹھے ہو کر ایک دوسرے کے خیالات سے استفادہ حاصل کر رہے تھے۔ مشرقی گوشے میں بنجامن کا بینڈ دھیمے سروں میں 'ہے جمالو' کی سندھی لوک دھن بجا رہا ہے۔ دریا کے کنارے ریلنگ کے ساتھ کرسیاں ڈال دی گئی ہیں۔ مہمان بیٹھ چکے ہیں۔ کچھ لوگ ریلنگ سے ٹکے خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ ڈاکٹر بلوچ ڈائننگ ہال سے نکل کر لان میں آئے تو تنہا بیٹھی ہوئی صنم کے پاس چلے آئے۔

"مس صنم! آیئے آپ کی ملاقات ایک اہم شخصیت سے کرواؤں۔"

صنم چونک گئی۔ "جی بلوچ صاحب۔"

"آیئے۔" اور دونوں اس جانب بڑھ گئے، جہاں تہران یونیورسٹی کے ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری کے ہیڈ ڈاکٹر خالد تنہا بیٹھے کوک سے شغل کر رہے تھے۔

مسٹر بلوچ دونوں کا تعارف کراتے ہیں۔

"آپ مس صنم سومرو ہیں، ڈپارٹمنٹ آف سندھیالوجی کی ڈائریکٹر۔ سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کی چیئر پرسن۔ ہسٹری میں ایم اے اور پی ایچ، ڈی۔ فارسی میں ڈی لٹ اب معارفِ اسلامیہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہی ہیں۔"

ڈاکٹر خالد اس خوبصورت لڑکی کو دیکھے جا رہے ہیں۔ جو قطعاً اتنی ساری ڈگریوں کا بوجھ اُٹھائے نظر نہیں آ رہی ہے۔ سیدھے سادے سفید لباس میں بالوں کی سادی سی چوٹی ڈالے وہ سامنے مسکراتی کھڑی تھی۔

"آپ مسٹر خالد ہیں۔ اس تاریخی اجتماع میں شرکت کے لیے ایران کی نمائندگی کرنے تہران سے تشریف لائے ہیں۔ آپ بیک وقت تدریس، تاریخ، ادب، لسانیات تحقیق، آثارِ قدیمہ، موسیقی اور لوک ورثے میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ سندھ کی تحقیق و تاریخ کے شعبے پر آپ کی توجہ زیادہ ہی رہی ہے۔"

بلوچ صاحب ڈاکٹر خالد کا تفصیلی تعارف کروا بیٹھے۔

"آپ سے مل کر بے حد مسرّت ہوئی۔" صنم کے لبوں پر پھیلی ملکوتی مسکراہٹ دیکھ کر ڈاکٹر خالد سے رہا نہ گیا۔

"یہ جملہ بہت پُرانا ہے صدیوں پُرانا، لیکن آپ کے لبوں سے بہت پیارا لگا۔" خالد کی نظر صنم پر پڑی تو شرمیلی نگاہیں انھیں بڑی بھلی لگیں۔

انتظامیہ کے ایک صاحب بلوچ صاحب سے کچھ کہنے لگے۔ پھر وہ معذرت کر کے ڈائننگ ہال کی جانب چلے گئے۔

صنم کی آنکھیں ہیروں کی طرح چمک اُٹھیں۔

"انسان خوشی کے اظہار کے لیے اس سے بہتر جملہ کہاں سے لائے۔" صنم نے ٹالنا

چاہا۔

"کچھ جذبے اظہار کے مرہونِ منت نہیں ہوتے۔ شاید اس وقت آنکھیں ہی سب کچھ کہہ جاتی ہیں" خالد مسکرا دیے۔

"آپ تاریخ کے ڈاکٹر ہیں یا آنکھوں کے" صنم ہنس پڑی۔

"آنکھوں کی تحریر پڑھنے کے لیے ڈاکٹر ہونا ضروری تو نہیں"

صنم بات بدل کر آگے بڑھ گئی اور ایک ایزی چیئر کھینچ کر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"ڈاکٹر بلوچ ہمارے ملک کے محقق، ادیب اور دانشور ہی نہیں بلکہ بڑی پہلودار شخصیت ہیں۔ اس تاریخی اجتماع کے روحِ رواں وہی ہیں۔ تمام مہمانوں کے آرام و قیام کی ذمّے داری، کانفرنس کا انتظام غرضیکہ ساری ذمّے داریاں، بلوچ صاحب کے سر ہی ہیں۔ ۱۸، ۱۶ گھنٹے کام کرتے ہیں لیکن آپ کی پیشانی پر کوئی بھی پریشانی بَل بن کر نہیں آتی۔

ڈاکٹر خالد مسکرا کر بولے۔

"اچھے اور مکمّل انسان کی پہچان یہی تو ہے"

صنم نے پوچھا۔

"آپ تو ایرانی ہیں، پھر آپ کو سندھ کی تاریخ سے کیسے دلچسپی ہو گئی"؟

"سندھ کی خوبصورتی کے سبب"

ڈاکٹر خالد کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"جی"۔ صنم چونک پڑی۔

اسی وقت مسٹر انور تونیو اور ان کے ساتھی وہاں آ گئے تو خالد نے بات بدلی۔

"پاکستان کے دوسرے خطوں کے مقابلے میں سندھ کی تاریخ پر بہت کام ہوا ہے اس تاریخ کے ماخذ کی اکثریت فارسی میں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دلچسپی فطری ہے۔"

"پھر تو قبل از اسلام سے لے کر آج تک کا ہر دَور آپ کے مطالعہ میں آیا ہوگا"؟ صنم نے پوچھا۔

خالد نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"جی ہاں! لیکن عربوں کی آمد سے پہلے کا مواد تو ملتا ہی نہیں۔ کیونکہ شاید یہاں تاریخ و تحقیق کا کام ہوا ہی نہیں ہے بصرف مسلمان ہی اس میدان میں آگے تھے۔ ہندوستان کے تمام ماخذ میں صرف دریائے سندھ کا ذکر ہی ملتا ہے۔ سندھ کے لیے اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ گجرات اور پنجاب والوں نے اسے سوچا بھی نہ ہوگا۔ جب کہ وہ لکھ بھی سکتے تھے"۔

خالد اور صنم کی اس گفتگو سے انور تونیو صاحب اور اُن کے ساتھیوں کو کیا غرض تھی وہ تو ٹرانسپورٹر اور وڈیرے تھے، سندھی تھے انھیں غرض تھی تو صرف پیسے سے تاریخ اور جغرافیے سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ سو وہ معذرت کر کے اُٹھ گئے۔

ڈاکٹر خالد نے اُن کے جانے کے بعد کہا۔

"شام کا یہ پہر، خوبصورت اور چنچل ہو اور آپ کا ساتھ ایسے میں تاریخ کے اوراق الٹنا اچھا نہیں لگ رہا ہے" تو صنم گھبرا گئی کہ اس کو سنبھالا دینے منگھی صاحب اور ڈوگر صاحب چلے آئے۔ خالد مجبوراً تاریخ کے اوراق پھر پلٹنے لگے۔

"فتح نامہ یا چچ نامہ یہ ایک عربی کتاب فتوح السندھ کا ترجمہ ہے، پھر تاریخ معصومی اور تحفتہ الکرام سندھ کی سرزمین اپنے اندر ہزار ہا اسرار چھپائے ہوئے ہے"۔

"آپ تاریخ کی ایسی کسی کتاب کے بارے میں بتائیں گے جو جدید اصولوں کو پورا کرتی ہے یعنی کہ ماڈرن ازم"۔

منگھی صاحب اور ڈوگر معذرت کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے تو ڈاکٹر خالد ریلنگ سے ٹکی ان ماڈرن لڑکیوں کی جانب نظر ڈال کر شرارتاً بولے۔

"یہ ہے ماڈرن ازم"۔

"میں تاریخ کی بات کر رہی ہوں"۔ صنم نے مسکرا کر کہا۔

"سندھ کی تاریخ تمہاری طرح ہی پُراسرار ہے"۔

کچھ لوگ قریب سے گزرے تو خالد نے موضوع بدلا۔

"دیکھا جائے تو ہم خود اپنے ہاتھوں اپنی تاریخ کا صفایا کر رہے ہیں۔ اپنے لوگ اپنی تاریخ کو گالیاں دیتے ہیں اور اپنی روایات کا گلا گھونٹ کر اپنی تاریخ کو مسخ کرتے ہیں"

صنم کے چہرے پر کئی رنگ سے آ کر گزر گئے۔ پھر وہ بڑے کرب سے بولی۔

"ہاں ڈاکٹر صاحب روایات کا گلا گھونٹ دینے سے تاریخ مسخ ہو جاتی ہے"۔

"سندھ کے لوگ روایات پسند ہیں۔ مس صنم روایات ہمیں مصلوب ہونا یا مصلوب کرنا نہیں سکھاتیں۔ ماڈرن ازم تو یہ ہے کہ محبِّ وطن ہو کر، غیر جانبدار ہو کر اپنے دور کے حالات اور روایات کو سامنے رکھ کر تاریخ لکھی جائے۔ بادشاہوں یا لیڈرانِ کرام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے نہیں"۔

صنم کا چہرا کسی اندرونی کرب سے سلگ اُٹھا اور وہ تڑپ کر بولی۔

"ہر دَور کی اپنی اقدار ہوتی ہیں، لیکن سندھ تو آج بھی چودھویں صدی میں سانس لے رہا ہے"۔

"ہاں اقدار کے پیمانوں سے ہی تاریخ کو تولنا پڑتا ہے۔ ہر خطّے کی تاریخ وہاں کی روایات اور اقدار سے عیاں ہوتی ہے۔ اسی لیے تو قیمتی ہوتی ہے"۔

"ریگستانوں میں راتیں جلد ہی ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔ پھر دریا کا کنارہ"۔ صنم نے بات بدلنی چاہی۔

"اچھا تو سندھ کی نم ہوائیں آپ کی آنکھوں میں اتر آئی ہیں"۔ ڈاکٹر خالد مسکرا دیے "آپ کی آنکھیں ہیں یا دریچے"۔

اُسی وقت ڈاکٹر بلوچ بوتل کے جن کی طرح آ گئے تو صنم کی جان بچ گئی۔ ڈاکٹر بلوچ پوچھ بیٹھے۔

"آپ بور تو نہیں ہو رہے ہیں"؟

"ساتھی حسین اور ذہین ہو تو کون بور ہوگا۔ جناب وقت کی قیمت مل جاتی ہے"۔ ڈاکٹر خالد کی آنکھیں شرارت پر اتر آئی تھیں۔

"آپ اپنے وقت کی قیمت وصول کرنا جانتے ہیں"۔ صنم بھی ہنس پڑی۔

"زندگی بڑی ہی مختصر ہے اور وقت بھی بہت کم اور یہ ہر وہ چیز جو کم یاب ہو بڑی قیمتی ہوتی ہے۔ قیمتی چیزوں کو کون ضائع

کرسکتا ہے:" ڈاکٹر خالد ہنس پڑے۔
"آپ لوگ ادھر آجاتے دیکھئے ابھرتے چاند کی خوبصورتی دریا میں کیسا خوبصورت منظر پیش کررہی ہے۔" بلوچ صاحب یہ کہہ کر پھر آگے بڑھ گئے تو دونوں ہی دریا میں اور افق پر لال طباق سے چودھویں کے چاند کو سر اُٹھاتے دیکھنے لگے۔ صنم اس نظارے میں گم ہوگئی تو ڈاکٹر خالد بول پڑے۔
"قدرت نے کیسی کیسی خوبصورت چیزیں ہمیں عطا کی ہیں۔"
صنم چونک پڑی پھر پانی پر جھلملاتی روشنیوں کے عکس دیکھ کر بولی۔
"جانے سندھو دریا کا یہ سفر کب سے جاری ہے۔"
"میں تو ۴۰ سالوں سے زندگی کے اس سفر میں ہوں۔ اب تک تھکا تو نہیں، ہاں ٹھہر گیا تو شاید ڈھے جاؤں گا۔" خالد جانے کیا کہنا چاہتے تھے۔
"سفر میں تو ساری کائنات ہے۔"
صنم نے پھر راہ بدل دی۔
"ہر مسافر کی کوئی نہ کوئی منزل ہوتی ہے۔" ڈاکٹر خالد نے پھر کچھ کہنا چاہا۔
"شاید میری کوئی منزل نہیں۔" صنم تلخ ہوگئی۔ "کچھ مسافر ایسے بھی تو ہوتے ہیں۔"
صنم کا دل ڈوبنے سا لگا تھا۔
"زندگی کے اتنے سال گزارنے پر بھی آپ اپنی منزل کا تعین نہ کرسکیں۔"
"سندھ کی عورت کا اپنی زندگی پر کون سا حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی منزل کا تعین کرسکے۔ ہم تو اپنی روایات اور اقدار کی پابند ہیں۔" صنم دھیمے سے ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں بولی۔
"آپ کی زندگی بے مقصد ہے۔" ڈاکٹر خالد حیرانی سے پوچھ بیٹھے۔
"جب کوئی منزل ہی نہ ہو تو مقصد اور راستے کیا معنی رکھتے ہیں۔" صنم نے پلٹ کر انھیں دیکھا۔
"اسی لیے جوگن کا یہ روپ دھار لیا یہ کفن رنگ لباس، میک اپ سے عاری چہرا، زندگی کے رنگوں سے دور رہ کر کب تک جی سکیں گی، آپ تو تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔"
ڈاکٹر خالد بہت سے سوالات کر بیٹھے۔
"آپ کے پاس وقت کی کمی تھی اور میرے پاس فراوانی۔ کرنے کو کچھ نہ تھا سو تعلیم حاصل کرتی رہی۔"
"عورت کا کام تو تعمیر اور تخلیق ہے۔"
خالد نے پھر کچھ کہنا چاہا۔
"تاریخ سندھ سے متعلق فارسی کے اصل ماخذ کو مرتب کرنے میں بلوچ صاحب کی مدد کررہی ہوں۔ سورس میٹیریل آن سندھ کی ترتیب میں بھی ان کا ہاتھ بٹا رہی ہوں۔ یہ تخلیقی کام ہیں نا؟" صنم نے جان بوجھ کر بچنا چاہا۔
"آپ اتنی نادان تو نہیں۔" ڈاکٹر خالد بول پڑے کہ بلوچ صاحب آگئے۔
"دو آئیے سر کھانا لگ گیا ہے۔" بلوچ صاحب دیگر مہمانوں کو لینے چلے گئے، تو ڈائننگ ہال کی جانب بڑھتے ہوئے ڈاکٹر خالد بول پڑے
"بات بدل دینے سے نہ تو بات کی اہمیت ختم ہوسکتی ہے نہ بات ختم ہوسکتی ہے۔"
صنم پلیٹ میں چکن ڈال کر اُن کی جانب بڑھانے لگی تو بلوچ صاحب بول پڑے۔
"مس صنم کل صبح آپ مسٹر خالد کو سندھ کے مشہور تاریخی مقامات کی سیر کروانے لے جائیں گی۔"
"سر وہ آفس ورک"... صنم نے بچنا چاہا۔
"وہ ڈوگر صاحب سنبھال لیں گے۔ آپ خالد صاحب کا ساتھ دیں گی۔" تو صنم کچھ کہہ نہ سکی اور ڈاکٹر خالد مسکرا پڑے۔

نیشنل ہائی وے پر گاڑی بڑھتی چلی جارہی تھی۔ چوکنڈی کے قریب پہنچ کر صنم بول پڑی۔
"یہ چوکنڈی کے مقابر ہیں۔"
خالد نے سڑک پر ٹریفک کے شور کو دیکھا اور بولے۔
"کراچی جیسے زندہ اور چلبلے شہر کے پہلو میں یہ شہر خموشاں کچھ عجیب سا نہیں لگ رہا ہے؟"
"ہاں جیسے زندہ انسان کے سینے میں دل مردہ۔" صنم نے چہرے پر زخمی سی مسکراہٹ سجا کر کہا۔ اور کار کو کچی روڈ پر ڈال دیا۔
"یہاں سولہویں اور اٹھارھویں صدی کے بلوچ قبائل کے مقابر ہیں۔"
"دل کبھی مردہ نہیں ہوتا صنم۔ ہم اپنی سوچ کا انداز بدل ڈالیں تو ہر شے میں زندگی مل جاتی ہے۔ دیکھئے اس شہر خموشاں میں کتنے دل دھڑک رہے ہیں جو ہمیں اپنی جانب بُلا رہے ہیں۔"
صنم نے گاڑی روک لی اور ڈاکٹر خالد نے مقابر کی تصاویر کھینچنی شروع کردیں صنم کوک کی بوتلیں لیے چلی آئی۔
"آپ دھوپ اور گرمی سے پریشان نہ ہوجائیں۔ جلدی کیجیے گا ابھی بھنبور بھی چلنا ہے۔"
"سسّی کا بھنبور۔" خالد پوچھ بیٹھے۔
"ہاں سسّی پنّوں والی سسّی کا بھنبور۔" صنم بول پڑی۔
"سندھ کی مٹی کا خمیر محبت سے گندھا ہوا ہے۔" ڈاکٹر خالد ہنس پڑے، "لیکن پھر بھی یہاں کے لوگ محبت کے معنی نہیں سمجھتے۔"
موسی گوٹھ کا ایک بندہ چھاچھ کے گلاس بھر لایا تو صنم نے کہا۔
"یہاں کے لوگ بہت محبت والے اور پرخلوص ہوتے ہیں۔ لیجئے یہ اُن کی محبت کا نذرانہ حاضر خدمت ہے۔"
ڈاکٹر صاحب مسکرا دیے۔
صنم نے سامان سمیٹا اور کار کی جانب بڑھ گئی۔ اور کچھ دیر بعد ہی اُن کی گاڑی پھر نیشنل ہائی وے پر بڑھتی چلی جارہی تھی۔

بھنبور میں ہر سو ویرانی ہی ویرانی تھی۔
میوزیم دیکھ کر وہ قلعے کی فصیل کی طرف بڑھ گئے۔ مسٹر ابڑو اُن کے ہمراہ آنے لگے تو صنم نے انھیں تکلیف نہ کرنے کے لیے کہا اور دونوں آگے بڑھ گئے۔
"یہ قلعے کی فصیل ہے اور یہ گہرائی میں چار تہیں ہیں۔ چار مختلف ادوار۔ کیسے کیسے زمانے گزر گئے۔ کیسے کیسے پیارے پیارے لوگ آکر چلے گئے۔ لیکن یہ دکھوں کی فصیل فصل بن کر ہر بار اُگ آتی ہے اور ہم اسے

کاٹتے کاٹتے تھک کر ابدی نیند سو جاتے ہیں۔"

"زندگی یاسیت تو نہیں، خوشی اور مسرت بھی تو ہے۔ آپ نے دراصل ردا کی طرح درد و غم کو اوڑھ لیا ہے صنم۔"

اُسی وقت کچھ گوٹھ کے سندھی گدھوں پر لکڑیاں لے کر ادھر سے گزرے تو صنم اُن سے سندھی میں بات کرنے لگیں اور ڈاکٹر خالد تصویریں کھینچنے لگے۔

کار ٹھٹھہ کے علاقے مکلی کی حدود میں داخل ہو گئی۔ "دنیا کا سب سے بڑا قبرستان ہے یہاں۔ چھ مربع میل کے علاقے میں پھیلا ہوا ہے بلکہ اس کا سلسلہ یہاں سے حیدر آباد تک چلا گیا ہے۔ یہاں سامنے سولہویں صدی کے مقابر ہیں۔" گاڑی قبرستان میں لے کر چلی آئی صنم۔

بہت سے لوگ پیدل ہی قبروں کے درمیان کچے راستے پر بڑھے چلے جا رہے تھے۔

"آپ کے ہاں لوگ مردہ پرست ہیں۔ دیکھئے کیسے گھوم رہے ہیں قبروں کے ارد گرد اور جب یہی لوگ زندہ ہوں گے تو ان کے مرنے کی تمنا کرتے رہے ہوں گے۔" خالد ہنس پڑے۔

"ہاں ہم مردہ پرست قوم ہیں۔" صنم کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"ویسے یہ سب لوگ کہاں جا رہے ہیں، اس جانب کافی رش ہے۔" ڈاکٹر خالد نے کار سے اتر کر کہا۔

"ایک بزرگ ہیں بابا اصحابی کہتے ہیں اُنھیں لوگ، انھیں کے مزار پر جا رہے ہیں۔"

"کیوں؟" خالد پوچھ ہی بیٹھے۔

"ہر ایک کے اپنے دکھ ہیں۔ کوئی اولاد مانگتا ہے تو کوئی دولت۔ کوئی سُکھ کی چاہ میں آتا ہے تو کوئی پناہ کی طلب میں۔" صنم نے کار لاک کی اور جوس کا پیکٹ آگے بڑھا دیا۔

"چلیئے ہم بھی چلتے ہیں۔" ڈاکٹر خالد ہنس کر بولے۔

"جی نہیں! میری کوئی خواہش نہیں کوئی مراد نہیں۔" صنم نے جوس سپ کرتے ہوئے کہا۔

"اتنی کم عمری میں ایسی باتیں، ابھی تو آپ بوڑھی نہیں ہوئیں۔"

"انسان عمر سے نہیں تجربات سے بوڑھا ہوتا ہے۔ میں نے جو کچھ دیکھنا تھا دیکھ لیا؟" صنم پھر تلخ ہو گئی۔ پھر آگے بڑھ کر کہا۔ "آئیے اندر چلتے ہیں۔ یہ مغل خاندان کے ٹھٹھہ کے گورنر عیسیٰ خان ترخان کا مقبرہ ہے۔ مجھے یہ عمارت اس قدر پسند ہے کہ کیا کہوں؟ میرا ڈرائیور جب بھی ادھر سے گزرتا ہے تو کہتا ہے کہ بیگم صاحبہ! آپ کا مقبرہ آ گیا۔" صنم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"خدا کا شکر ہے کہ آپ بھی ہنستی ہیں۔"

دونوں اندر آ گئے۔ چٹانوں سے تراشے ہوئے ستونوں کے نیچے ٹھنڈک ہی ٹھنڈک تھی۔ صحن میں لگے نیم کے پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں میں خالد سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔

"آپ مزار تک نہیں چلیں، آئیے یہاں بیٹھ کر ہی دعا مانگ لیں۔ ہر انسان ایک برگزیدہ بندہ ہے۔ آج میں عیسیٰ خان ترخان کو گواہ بنا کر دعا مانگتا ہوں۔

"اے خدا! میں نے اس زندگی میں ایک ہی ہستی سے پیار کیا ہے اور وہ میرا صنم ہے۔ میری زندگی کا خاتمہ اسی کے در پر ہو۔"

خالد کے پھیلے ہاتھوں اور بند آنکھوں کو دیکھ کر صنم سہم گئی۔ خالد نے آنکھیں کھول کر کہا۔

"دیکھنا میری یہ دعا ضرور قبول ہوگی۔"

"خالد! خدا کے واسطے..." صنم روہانسی ہو گئی۔

"ہم انسان بھی عجیب مخلوق ہیں۔ زندگیاں گزار لیتے ہیں پتہ ہی نہیں چلتا ہے کہ محبت جو کہ زندگی کا ایک لازمی جزو ہے اسے کبھی پایا یا نہ پانے کی کوشش کی۔"

صنم مسکرا دی۔

"آپ تو شادی شدہ ہیں۔ بچے بھی ہیں آپ کے۔"

"شادی کر لینا دو چار بچوں کے ماں باپ بن جانا ہی محبت کو پا لینا نہیں ہوتا۔" خالد سنجیدہ ہو گئے۔

"آپ کو اپنی بیوی بچوں سے محبت نہیں ہے۔" صنم نے پوچھ ہی لیا۔

"بیوی کو میرے پیسے سے محبت تھی، بنگلے، گاڑی سے محبت تھی اس نے اپنی دنیا الگ بسا لی۔ بیٹا اور بیٹی انگلینڈ میں پڑھ رہے ہیں۔ جب ان کے پاس پیسے ختم ہو جاتے ہیں تو ضرور میری یاد آ جاتی ہے۔ دنیا بڑی ظالم جگہ ہے صنم بی بی۔ ہر انسان صرف اپنے دکھ کو ہی پہاڑ سمجھتا ہے۔ دوسروں کی صلیبیں بھی تو دیکھئے ان کے شانوں کے زخم پر بھی تو نظر ڈالیے۔"

"آپ سنجیدہ اور رنجیدہ اچھے نہیں لگتے چلیے اور جگہیں بھی دیکھنی ہیں۔ دوپہر کا کھانا کینجھر لیک پر کھانا ہے۔ سہتو صاحب وہاں اپنے یونٹ کے ساتھ ہمارا انتظار کریں گے۔"

"ایک بات یاد رکھنا صنم! یہ مقبرہ یہاں کی فضائیں۔ یہ مزار یہ سناٹا یہ عیسیٰ خان ترخان اور اس قبرستان کی ساری روحیں گواہ ہیں کہ میں یہاں پھر آؤں گا، ضرور آؤں گا۔" خالد جذباتی ہو کر صنم کا ہاتھ تھام بیٹھے۔ صنم گھبرا کر بولی۔

"ضرور آئیے گا لیکن ابھی تو چلیے۔" اور دونوں باہر نکل کر دوسرے مقابر کی تصاویر کھینچنے لگے۔ پھر کلری (کینجھر) جھیل کی جانب چل پڑے۔

چاندنی رات میں وی، آئی، پی گیسٹ ہاؤس کے ٹیرس پر کرسیاں ڈال دی گئی تھیں اور قالین اور گاؤ تکیے بھی لگا دیے گئے تھے۔ چاند کی چاندنی جھیل کے پُرسکون پانی پر رقصاں تھی۔ سیڑھیوں کی دونوں جانب پھولوں کی کیاریاں تھیں اور پھر جھیل کے پانی میں کشتی ہچکولے لے رہی تھی۔ سامنے وی۔ آئی۔ پی گیسٹ ہاؤس کی خوبصورت عمارت بنی ہوئی تھی۔ تھکے ہارے ڈاکٹر خالد گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز تھے۔ مچھیرے اپنی کشتیوں میں مچھلیاں پکڑ رہے تھے اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کھاتے ہوئے صنم ایزی چیئر پر دراز نوری کی قبر پر جلتے دیے کو نہارے جا رہی تھی۔ چاروں طرف پانی ہی پانی اور بیچ میں نوری کی قبر۔ اس پر ٹمٹماتا دیا۔ کیسا بھلا

لگ رہا تھا اور نوری کے مزار پر بیٹھا کوئی گا رہا تھا۔

آج بھی آسمان سے بادلوں کے برسنے کی اُمید ہے سکھیو! بادلوں کو دیکھ کر مجھے میرا محبوب یاد آگیا ہے (بھٹائی کے اشعار کا ترجمہ) میں آس لگائے بیٹھی ہوں۔ پیاسی زمین ترو تازہ ہو جائے۔ کاش ساون میں میرا محبوب میرے ساتھ ہو۔

"کتنی خوبصورت جگہ ہے یہ" خالد بول پڑے۔

"ہاں یہ جگہ مجھے بہت پسند ہے۔" صنم ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

کیاری میں کھلے پھولوں کی خوشبوئیں جھیل کے کنارے اُگی گھاس میں بولتے ہوئے مینڈکوں کی ٹرٹر، جھاڑیوں میں چھپے جھینگروں کی آوازیں، ماہی گیروں کے چپوؤں کی شپ شپ، آسمان پر چمکتے چاند کا عکس، پانی میں بہت حسین نظر آرہا تھا۔

صنم اُڑتے بالوں کو سمیٹ کر بولی۔

"جب زندگی کے ہنگاموں سے تھک جاتی ہوں تو یہاں آکر گھنٹوں تنہا بیٹھ جاتی ہوں۔ یہاں کی خاموشی اور سناٹا بڑا پیارا لگتا ہے مجھے۔"

"خاموشی اور سناٹے سے پیار" خالد ہنس پڑے۔

"ہاں خاموشی اور سناٹے میں اپنے آپ سے باتیں کرنے کا موقع ملتا ہے" صنم بالوں کی لٹ گھماتے ہوئے بولی۔

"اپنے آپ سے باتیں کرنے سے دکھ بڑھ جاتے ہیں" خالد نے سمجھانا چاہا۔

"جب کوئی اپنا نہ ہو تو اپنے آپ ہی سے باتیں کرنی ہوتی ہیں" صنم نے یعقوب کو آواز دی اور یعقوب کافی لے آیا۔

صنم نے کافی کا مگ آگے بڑھایا تو ڈاکٹر خالد نے پوچھا۔

"ابھی تک آپ کو کوئی ایسا نہیں ملا جسے اپنا کہہ سکیں۔؟"

صنم بات سمجھ گئی پھر جھیل کے پانی کی جانب دیکھتے ہوئی بولی۔

"یہ جھیل سنہری اور کینجھر جھیل کو ملا کر بڑی کر دی گئی ہے۔"

"آپ سے جب بھی کوئی ذاتی سوال کرتا ہوں آپ بات بدل دیتی ہیں" خالد منہ بنا کر بولے۔

"ہم یہاں ذاتیات پر نہیں تاریخ پر ریسرچ کرنے آئے ہیں" صنم نے ٹوکا۔

انسانوں سے ہی تاریخ ہے۔ انسان نہیں تو تاریخ بھی نہیں۔ تعلقات کی گہرائی ہو تو انسان ذاتیات بھی کھنگال سکتا ہے۔"

"کہتے ہیں کہ ایک مچھیرا تھا جس کا نام کینجھر تھا اور اس کی بیوی کا نام سنہری تھا، اُن کی بیٹی کا نام نوری تھا۔ جسے جام تماچی نے اپنی بیوی بنا لیا تھا لیکن وہ نوری اپنے ماں باپ اور اس جھیل کو نہیں بھولی تھی اسی لیے اس کا مزار یہاں پر ہے۔"

"ہم گزشتہ دس دنوں سے ساتھ ہیں" خالد بول پڑے۔

"دس دن" صنم ہنس پڑی۔

"ہاں! یوں تو دس سال بھی کم ہوتے ہیں ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے میں اور میری بیوی زندگی کے دس سال ساتھ گزار کر بھی ایک دوسرے کو سمجھ نہ پائے۔ لیکن ان دس دنوں میں یوں محسوس کر رہا ہوں جیسے ہم صدیوں اور قرنوں سے ساتھ ہیں۔" خالد جذباتی ہوگئے۔

"عرش سے فرش پر آجائیے میں گورنمنٹ کی ملازم ہوں اور آپ کی ہم سفر اور بس۔" صنم نے ہنس کر کہا۔

"ہم سفر انسان ہی ہوتے ہیں" خالد بول پڑے۔

"مجھے آپ انسانوں میں شمار نہ ہی کریں وہ لیجیے۔ مسٹر سہتو اور اُن کے ساتھی آگئے۔"

"یہ موہن جو دڑو ہے۔ دڑو ٹیلے کو کہتے ہیں۔ یہ مردوں کا ٹیلہ ہے۔"

خالد اس وقت دیر لڑنے میں کچھ اور دیکھنے کو راضی ہی نہ تھے وہ صنم کے چہرے کو نہار رہے تھے۔

"یہ بدھ مت کا استوپ ہے عبادت گاہ ہے" صنم نے اشارہ کیا۔

"سر تو ہم بھی جھکالیں۔ پر سجدہ بھی تو قبول ہو" خالد شرارت سے بولے۔

"یہ حمام ہے۔ آئیے سیڑھیاں اُترتے چلتے ہیں" دونوں اُتر کر بڑے حمام کے اندر آگئے۔

"یہ مشرقی جانب کنواں ہے" جب وہ اوپر آئے تو صنم بول پڑی۔

"گہرا تاریک! جس کی تہہ بھی نظر نہیں آرہی ہے" خالد نے طنز کیا۔

"اس کی تہہ پاکر کیا کیجیے گا؟" صنم نے پوچھا۔

"اس کا اسرار؟"

"آئیے ان گلیوں میں اس کا اسرار تلاش کریں" صنم ہنس پڑی۔

"یہ گلیاں تمہاری آنکھوں کی طرح ویران ہیں۔ یہ کوچے تمہارے لبوں کی طرح مسکرانا نہیں جانتے" خالد بڑے ٹھنڈے لہجے میں بولے۔

صنم ایک اینٹ سے ٹکرا کر لڑکھڑائی تو خالد نے انھیں تھام لیا۔ اور بولے۔

"آپ کے ہاتھ یخ ہو رہے ہیں۔"

"موسم بھی تو ٹھنڈا ہو رہا ہے" صنم تڑخ کر بولی۔

"حرارت مستعار بھی تو لی جاسکتی ہے"

"عارضی خوشیوں سے دائمی دکھ بھلے ہوتے ہیں" صنم تلخ ہوگئی۔

"صنم!" خالد جھنجلا گئے "آپ کمپیوٹر سے انسان نہیں بن سکتیں کیا؟"

"ابھی تو ہڑپہ دیکھنے بھی چلنا ہے جہاں ۱۲ موسموں میں کھدائی ہوتی ہے، لیکن خزانوں کے متلاشی پہلے ہی آثار قدیمہ کو تہس نہس کر چکے تھے جہاں کا اپنا کوئی رسم الخط تھا لیکن ابھی تک اُسے کوئی نہ پڑھ سکا۔"

خالد جھنجلا کر رک گئے اور کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر اُسے گھورنے لگے۔

"ابھی سنکا جن جانا ہے جو کراچی سے تین سو میل دور ہے، علی مراد دادو سے بیس میل دور ہے۔ آمری یہاں موہن جو دڑو سے اسی میل کے فاصلے پر ہے۔ دابر کوٹ دریائے سندھ سے ایک سو بیس میل مغرب میں لورالائی کے جنوب میں واقع ہے" صنم انھیں نظر انداز

کرتے ہوئے بولی۔

"ہم اب کہیں نہیں جائیں گے۔" خالد نے تڑخ کر کہا۔

"میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔" ان کا لہجہ اندرونی تپش سے سلگ رہا تھا۔

"بھنور میں پھنس جانے والے کے گرد ایک حصار ہوتا ہے جسے توڑ کر کوئی نہیں نکل سکتا ہے۔" صنم کی آواز گلے میں پھنس رہی تھی۔

"حصار توڑے بھی جا سکتے ہیں۔" خالد نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ صنم کے شانوں پر رکھ دیے۔

صنم نے ان کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ "یہ وہ حصار نہیں جو تعویز گنڈوں یا منتروں سے ٹوٹ جائے خالد یہ ہماری روایات کا حصار ہے۔ ہماری روایات آہنی دیواروں کی طرح ہوتی ہیں، جنھیں توڑنا کسی کے بس میں نہیں۔"

"آپ اپنے والد سے ڈرتی ہیں۔ ڈاکٹر بلوچ نے بتایا تھا کہ صرف آپ کے والد ہی ہیں۔ میں اُن سے بات کروں گا۔" خالد نے اُن کے بال سنوارتے ہوئے کہا۔

"نہیں!" صنم گھبرا گئی۔

"مجھے پتہ ہے کہ ہر بیٹی باپ سے زیادہ محبت کرتی ہے۔" خالد نے اس کے آنسو پونچھے۔

"ہاں بہت محبت کرتی ہوں۔" صنم تلخ ہو کر جھٹکے سے علیحدہ ہوئی اور سیڑھیوں کے چبوترے پر بیٹھ گئی۔ خالد بھی پاس آ بیٹھے۔

"میں اتنا پیار کرتی ہوں ان سے کہ برسوں سے اُن کی موت کی دعائیں مانگتی رہی ہوں، لیکن یہ میری اکلوتی دعا بھی اللہ سائیں نے قبول نہ کی۔" وہ رو پڑی۔

"کیا؟ موت کی دعا؟" وہ حیرت زدہ ہو گئے۔

"ہاں وہ مر جائیں تو میں جی اٹھوں گی لیکن نہ وہ مرتے ہیں نہ میں جی اٹھتی ہوں۔" اس نے بہتے آنسوؤں کو پونچھنا گوارہ نہ کیا۔

"میں، میں۔" خالد کچھ نہ بول پائے۔

"آپ دس دنوں سے میری ذات کے اسرار جاننا چاہتے تھے تو سُنیے۔ میری ذات کا یہ قلعہ تیس برسوں سے محصور ہے۔ میں اکلوتی ہوں۔ ماں کی آنکھ کا تارہ تھی اور باپ کے آنگن کا چاند۔ میرے والد ہمارے قبیلے کے سردار ہیں۔ ہمارا قبیلہ اندرونِ سندھ صحرا میں رہتا ہے۔ ہمارے قبیلے کی روایت ہے کہ قبیلے اور گوٹھ سے باہر شادی ہو ہی نہیں سکتی۔ ہمارے قبیلے نے جانے کب اسلام قبول کیا لیکن اسلام قبول کرنے سے پہلے ستی کی رسم عام تھی۔ کہتے ہیں کہ ہماری کوئی آبی بڑھی کو چتا پر بٹھا دیا گیا تھا وہ بچی تھی آگ سے ڈر کر بھاگ نکلی اور دریا تیر کر اس پار آ گئی اور یہاں کسی غیر مسلم کے گھر بس گئی ہم اُسی کی اولاد میں سے ہیں۔ بڑے بزرگ کہتے ہیں کہ تب سے کسی لڑکی کو اُس کی زندگی میں سکھ نہ ملا۔ خیر خاندان بھر میں مجھ سے بڑا کوئی لڑکا نہیں کہ میری شادی اُس سے ہو سکتی۔ جب یہ بات ماں کو گھن کی طرح کھا گئی تو وہ قبر کے اندھیروں میں جا سوئیں۔" صنم کا گلا بھر آیا اور وہ چُپ ہو گئی۔ ڈاکٹر خالد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"بچپن میں ایک عزیز کی شادی میں کراچی آئی تھی۔ یہاں چھوٹی چھوٹی بچیوں کو اسکول جاتے دیکھا تو مجھے بھی پڑھائی کا شوق ہوا کتابیں من کو بھا گئیں اور میں نے تعلیم حاصل کرنے کی ضد کی تو بابا نے قبیلے والوں سے چھپا کر ڈاکٹر بلوچ کے سپرد کر دیا مجھے اور میں پڑھائی میں دل لگا کر سب کچھ بھلا بیٹھی۔ ہمارے گھر تو قلعے ہوتے ہیں۔ ان کی دیواروں کے باہر تو وہاں کی گرد بھی نہیں جاتی ہے۔ ماسی فندق کی بیٹی صنم کا نام میں نے اپنا لیا اور میرا نام آرزو ماسی فندق کی بیٹی کو مل گیا اور وہ میری آرزو کو پورا کرنے میں معاون ہو کر خلیق سومرو کی بیٹی بن کر گوٹھ میں رہنے لگی۔ ہمارے گوٹھ میں اتنا پردہ ہے کہ نامحرم تو نامحرم گھر والے بھی اپنی لڑکیوں کو نظر بھر کر نہیں دیکھتے اور میں آج اس ویرانے میں ایک نامحرم کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بیٹھی ہوں۔" اُس کی آنکھوں سے اب بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

"پھر اب کیا ڈر ہے؟" خالد چہکے۔

"بابا سائیں نے مجھ سے ایک وعدہ لیا تھا اور کہا تھا۔ میں تمہیں تعلیم دلانے پر راضی ہوں، لیکن تم کبھی قبیلے کی روایات کو نہیں توڑو گی اور خاندان سے باہر شادی نہیں کرو گی۔" صنم بلک پڑی۔

"مجھے نہیں پتہ تھا کہ میں خود اپنے گرد ایسا حصار کھینچ کر قید ہو جاؤں گی کہ جسے توڑ کر باہر نکلنا میرے اپنے بھی بس میں نہ ہوگا۔"

"اوہ نو۔" کہہ کر خالد بھی خاموش ہو گئے۔

"سندھ اب بھی چودھویں صدی میں سانس لے رہا ہے۔ یہاں کی روایات اور اقدار کو چھوڑنا یہاں کے لوگوں کے بس کی بات نہیں یہاں کی عورت اب بھی جاہلیت کے دور کی عورت ہے۔ اُسے زندہ دفن تو نہیں کیا جاتا ہے لیکن جو زندگی وہ جی رہے ہیں اسے زندگی نہیں کہہ سکتے۔ یہاں کے لوگ کس طرح جی رہے ہیں آپ نے دیکھا نہ بجلی ہے نہ ٹرانسپورٹ نہ سڑکیں ہیں نہ راستے۔ چھوٹے قصبوں اور گاؤں میں نہ تو پانی ہے نہ بجلی نہ اسپتال نہ اسکول۔ اگر کوئی بیمار ہو جائے تو بڑی سڑک پر پہنچانے کے لیے کوئی وسیلہ نہیں چارپائی پر ڈال کر جب اُسے شاہراہ تک پہنچاتے ہیں تو وہ مر چکا ہوتا ہے۔ یہاں کے لیڈران کرام اور وڈیرے سائیں شہروں میں رہتے ہیں وہ نہیں چاہتے کہ اُن کے لوگ تعلیم حاصل کر سکیں یا انھیں آرام دہ زندگی مل سکے۔ اور وہ پڑھ لکھ بن کر اُن کے آگے سر اُٹھانے کے قابل ہو سکیں۔" صنم بہت آزردہ تھی۔

"یہ اپنے گوٹھ قصبوں سے بھاگ کر شہروں میں جا کر تو تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔" خالد پوچھ ہی بیٹھے۔

"پیٹ بھر کر جس کے پاس کھانے کو نہ ملے وہ فرار کے بارے میں کب سوچ سکتا ہے جس پنچھی کے پر کاٹ دیے جائیں تو وہ اڑنے کے قابل کب ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی ایسی جسارت کر بھی بیٹھے تو اس کا پورا خاندان سردار کی ذاتی جیل میں ڈال دیا جاتا ہے، جہاں وہ تڑپ تڑپ کر جان دے دیتے ہیں۔ آپ کبھی ان جیلوں کا معائنہ کریں کتنے ہی پنجر آپ کو اپنی

داستانیں سُنانے کے منتظر ہوں گے۔ آپ سمجھ سکیں گے اُن کی زبان۔" صنم کی آواز بھرّا گئی۔

"محبت بڑی طاقت ہے صنم۔" خالد نے انھیں دلاسا دیا۔

"میرے خدا سے مجھے یہ گلہ نہیں ہے کہ اُس نے مجھے میرے محبوب کا چہرا نہیں دکھایا۔ گلہ تو یہ ہے کہ تمھیں بھیجا ہی کیوں جب میں اور آپ دریا کے دو کناروں کی طرح کبھی آپس میں مل ہی نہیں سکتے تھے۔ تو پھر ہمیں اس طرح اس موڑ پر کیوں لاکھڑا کیا۔" صنم کے آنسو پرنالوں کی طرح بہنے لگے۔

"اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔" خالد نے اُسے پیار سے کہا۔

"سب کچھ ختم ہو گیا ہے خالد۔ پچھلے ماہ میری منگنی میرے چچازاد سے ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر بلوچ نے نہیں بتایا۔" وہ تلخ ہو کر بول پڑی۔

خالد چونک پڑے۔ "وہ بڑا ہی خوش نصیب شخص ہو گا جو ..."

"نہ وہ خوش نصیب ہے نہ ہیں۔ وہ ابھی چھ برس کا ہے۔ صرف چھ برس کا بچہ۔" وہ زہر میں بجھا لہجہ خالد کا دل دکھا گیا۔

"چھ سال کے بچے سے تمہاری منگنی تم تو۔" ڈاکٹر خالد بوکھلا گئے۔

"ہاں میں تیس سالہ عورت ہوں اور وہ چھ سالہ معصوم بچہ ہے۔ ہمارے خاندان میں قبیلوں میں زیادہ عمر کی عورت اور کم عمر لڑکوں کی شادی کا رواج ہے۔ گھر کی دولت گھر میں رہے اس لیے ہمارے خاندان کے بزرگوں نے یہ روایات عام کر دیں جن کی آہنی سلاخوں کے پیچھے سندھی عورت مصلوب ہو کر رہ گئی ہے۔ سندھ کی عورت کی سسکیاں، کراہیں، آنسو کون دیکھتا ہے وہ تو اپنا کرب خود بھی نہیں پہچانتی ہے۔ میں تو تعلیم حاصل کر چکی تو برے بھلے کی تمیز کر بیٹھی ورنہ وہ تو بے چاریاں اپنی روایات کو ہی اپنا مذہب اپنی عبادت سمجھتی ہیں۔ مجھے آگہی حاصل ہوئی تو میں کرب کی سولی پر ٹنگی رہ گئی ہوں۔"

"ایسا کیوں ہے؟" آخر سندھی مرد یہ کیوں نہیں سمجھتا کہ یہاں کی عورت کو بھی اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق ہے۔ پھر اسلام تو ..." خالد جھنجلا گئے۔

"مت کریں ایسی باتیں پلیز۔ ہمارا اندر کا معاشرہ ہے وہ جس کام میں اپنی بھلائی سمجھتا ہے اُسے ہی مذہب اور عبادت کا نام دے دیتا ہے۔"

"مجھے اپنے پاپا سے تو ملاؤ صنم۔" خالد روہانسے ہو گئے۔

"نہیں خالد ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگلے ماہ میری شادی ہو جائے گی، میں کوٹھ چلی جاؤں گی۔ میں نے استعفیٰ دے دیا ہے، پھر کبھی شہر نہ آنے کے لیے اپنی حویلی میں قید ہو جاؤں گی جاؤ اس حصار سے بہت دور چلے جاؤ۔ مت دو دستک اب میرے دروازوں پر جاؤ چلے جاؤ، بند کواڑوں پر دستک نہ دو، دستک نہ دو۔"

وہ سفید لباس میں ملبوس ایک روح کی طرح اس کی زندگی سے نکل گئی۔

خالد تہران آکر بھی بے سکون رہے۔ پھر وہ پیرس چلے آئے۔ وہاں بھی دل نہ لگا تو فرعونوں کے دیس مصر آکر تاریخی ریسرچ میں لگ گئے، لیکن ایک صدا اُن کے پاؤں کی زنجیر بنی رہی۔

"ان بند کواڑوں پر دستک نہ دو۔ مصلوب ہو جانے دو مجھے فرسودہ روایات کی صلیب پر۔ جاؤ میری ذات کے کھنڈر پر دستک نہ دو۔"

وہ اکثر اداس ہو کر آسمان کی بلندیوں پر قسمت کے اس ستارے کو ڈھونڈنے لگتے جو اُن سے روٹھ کر دور کسی کہکشاں میں چھپ گیا تھا۔ اور اُن کی زندگی کو بے نور کر گیا تھا۔

وہ دلہن بنی سیج پر بیٹھی ہوئی تھی اور ایک ننھا سا معصوم چھ سالہ بچہ منہ میں انگوٹھا لیے اُس کے پاس سو رہا تھا اور وہ ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ پھر بڑے سکون سے اس نے اپنے زیور اُتارے، سائڈ بورڈ پر رکھے۔ سنگھار میز کے آئینے میں اپنے آپ کو نہارا اور الماری سے اپنا سفید جوڑا نکال کر پہنا اور سیج پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

پجیرو مسکلی کے قبرستان کے گیٹ پر آرکی۔ چوکیدار نے سلام ٹھوکا اور بھاگ کر لوہے کا بڑا گیٹ کھول دیا۔ پجیرو قبروں کے درمیان پکی سڑک سے ہوتی عیسیٰ خان ترخان کے مقبرے کے دروازے پر آرکی۔ چوکیدار نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور شہرام اُتر آئے۔ دوسری جانب سے ایک خوبصورت لڑکی بڑی ادا سے اتری اور دونوں ہی مقبرے میں داخل ہو گئے۔ چٹانوں سے تراشے ہوئے ستونوں کے نیچے ٹھنڈک ہی ٹھنڈک تھی۔ نیم کے گھنیرے پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں میں آکر شہرام نے جوس کا پیکٹ آگے بڑھا دیا۔ اور سیڑھیوں پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ڈیئر کیا رکھا ہے اس قبرستان میں چلو ریسٹ ہاؤس چلتے ہیں۔ دھوپ بڑھ جائے گی تو تمہارا رنگ کمہلا جائے گا۔"

"شہرام! تمہیں پتہ ہے کہ میں ہسٹری کی اسٹوڈنٹ ہوں اور اسٹڈی پر آئی ہوں اپنا ریسرچ مکمل کرنا ہے مجھے۔" نازاں نے کہا اور تصویریں لینے لگی۔

"آؤ چلو مقبرے کے اندر چلتے ہیں۔" نازاں نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا تو شہرام کو بھی مجبوراً اٹھنا پڑا۔ وہ آگے بڑھے تو ستون کی پچھلی جانب سے نکل کر اچانک آجانے والے ایک بوڑھے سیاح سے ٹکرا گئے۔ اس شخص نے ہاتھوں میں جو کچھ تھام رکھا تھا وہ سب بکھر گیا۔

"اوہ سوری!" شہرام نے کہا اور سامان اٹھانے لگا۔ ایک کتاب اٹھاتے ہوئے شہرام چونک گئے اور نازاں کو پکار کر کہا۔

"اے نازاں سنو! یہ دیکھو!" اور کتاب اس کی جانب بڑھا دی۔ "یہ کتاب میری وائف کی لکھی ہوئی ہے۔"

"اوہ نو۔" نازاں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں وہ میری طرح جاہل نہیں بہت پڑھی لکھی ہے۔"

بوڑھے سیاح نے بڑے غور سے شہرام کو دیکھا۔

شہرام اور نازاں معذرت کر کے مقبرے کے اندر چلے گئے تو بوڑھا سیاح سیڑھیوں والے

چبوترے پر آ بیٹھا۔ دل کی جانب عجیب سا درد جاگا اور پورے جسم میں سرایت کر گیا۔ شہرام اور نازاں باہر آئے تو دیکھا بوڑھا چبوترے پر گرا پڑا ہے۔ دونوں لپکے۔ شہرام نے چوکیدار کو آواز دی اور گاڑی سے کولر منگوایا۔ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیے اور منہ کھول کر جوس کے قطرے ٹپکائے، تو اس بوڑھے نے آنکھیں کھول دیں اور نحیف سی آواز میں کہا۔

"یہ مقبرہ گواہ ہے۔ یہ مزار، یہاں کا سناٹا عیسیٰ خان ترخان اور اس قبرستان کی ساری روحیں گواہ ہیں کہ میں یہاں لوٹ آیا۔" اور دل پر ہاتھ رکھ کر وہ بے ہوش ہوگیا۔

شہرام اور چوکیدار نے سیاح کو پجیرو میں لٹایا اور شہرام اور نازاں تیز رفتاری سے گاڑی کو سول ہسپتال لے کر پہنچ گئے۔ فوری طور پر بوڑھے سیاح کو طبی امداد دی گئی دل کا دورہ تھا۔ شہرام اور نازاں نے ایک پل کو بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ ہسپتال کے سامنے ہی کمشنر کا بنگلہ تھا۔ شہرام اور کمشنر لنگوٹیا یار تھے اس لیے اسپتال کا سارا عملہ سیاح کی جان بچانے میں لگ گیا۔ دو دن تک نازاں بھی کمشنر صاحب کی مہمان رہی۔ تیسرے دن سیاح کی طبیعت کچھ سنبھلی تو شہرام نے اس سے بات کرنی چاہی تو اس نے صرف یہی کہا۔

"آپ کو ایک ہی تکلیف دوں گا شاید میرا آخری وقت ہے آپ اپنے گوٹھ لے چلیے۔ مر جاؤں تو وہیں دفن کر دیجئے گا۔" اور پھر خاموش ہوکر آنکھیں بند کر لیں تھیں اس نے۔ کمشنر مراد بلوچ صاحب نے شہرام کی طرف دیکھا اور نازاں اور شہرام نے سیاح کی خواہش کے آگے سر جھکا دیا۔ اور پجیرو گوٹھ کی جانب بڑھتی چلی گئی۔

نازاں ایک ترک لڑکی تھی۔ انٹرکان کے ایک فنکشن میں شہرام سے اس کی ملاقات ہوئی شہرام اُسے ساتھ لیے اس کی ریسرچ میں اس کی مدد کرنے لگا۔

رئیس والدین کا اکلوتا بیٹا منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوا تھا۔ کئی سو ایکڑ زمین ہاری کسان مینیجرز کام سنبھالنے والے موجود اُسے کام ہی کیا تھا۔ گوٹھ میں وہ رہتا ہی کب تھا۔ کراچی کے ڈیفنس کے خوبصورت علاقے میں کوٹھی بنائی ہوئی تھی۔ سو یہیں پڑا رہتا چھ برس کی عمر میں ہی ماں باپ نے تیس برس کی ایک عورت سے بیاہ کر دیا۔ اس کا بچپن اس سے چھن گیا تھا۔ لڑکے بالے اُس کے ساتھ کھیلتے تو اس کا مذاق اُڑاتے۔ "دولہا آگیا، دولہا آگیا" اور وہ جھنجلا کر لڑ پڑتا تھا۔ بڑی عمر کے جوان اس کو راہ میں پکڑ کر کہتے "ارے دلہن کو چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو۔ گلی ڈنڈا کھیلنے لاؤ یار اپنی نال (بیوی) کو ہمارے حوالے کر جاؤ، ہے بڑی سوہنی"

تو وہ منہ بسور کر رو پڑتا تھا۔

بابا سائیں نے اُسے تعلیم حاصل کرنے کراچی بھیج دیا اور وہ چاچا امیر علی کے زیر نگرانی رہنے لگا۔ چھٹیوں میں گھر جاتا تو اس سفید سائے سے اُسے خوف آنے لگتا جسے لوگ اس کی بیوی کا نام دیتے تھے جو سدا کتابوں میں سر کھپاتی کچھ نہ کچھ لکھتی پڑھتی ہی رہا کرتی تھی۔ یوں تو وہ بے حد سیدھی سادی مخلص سی لڑکی تھی، لیکن جانے کیوں شہرام کے لیے ایک سایہ اور آسیب بن کر رہ گئی تھی۔

"یہ کیا کیا؟ میرے کاغذات کیوں بکھیر دیے؟ اوہ گاڈ میری کتابوں کو کیوں اِدھر اُدھر کر دیتے ہو؟ جاؤ باہر جاکر کھیلو، یہ شیشہ توڑ دیا نہ چلو باہر نکلو بشیر کہیں کے۔"

وہ ماں یا بڑی بہن تو لگ سکتی تھی، لیکن بیوی؟ وہ اماں کے پاس گھس کر سو جاتا۔

جوانی آئی تو شہر میں اسکول میں جان پہچان والوں میں لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں پھر اُسے گوٹھ کم ہی یاد آتا، اکثر تو چھٹیوں میں بھی وہ گھر نہ جاتا۔ پڑھنے لکھنے کی اس کو ضرورت تھی نہ چاہت اور سندھی رئیس لڑکوں کی طرح وہ بطور فیشن کے تعلیم حاصل کرنے میں لگا رہا تاکہ کمی اور ہاریوں کی نظر میں باعزت ہو سکے کہ سائیں کا بیٹا شہر میں پڑھ رہا ہے یہ نہیں کہ اُسے نفرت تھی صنم سے وہ اس کا دھیمے لہجے میں بات کرنا کتابوں میں سر کھپانا اُسے پسند تھا۔ وہ اس کا احترام تو کرسکتا تھا اسے بیوی کے رول میں قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔

جب ماں اور خالاؤں نے اُسے بے اولاد ہونے کا طعنہ دیا تو بڑے نرم لہجے میں اس نے کہا تھا۔

"شہرام پلیز آپ شادی کر لیں۔"

"تو وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھتا کھڑا رہ گیا تھا۔

"جی دیکھئے کبھی کوئی پسند آگئی، تو بتا دوں گا" کہہ کر وہ باہر چلا گیا تھا اور اب نازاں کو پاکر وہ بے حد خوش تھا۔ وہ اُسے گوٹھ لے کر یوں بھی جانا ہی چاہتا تھا کہ یہ بوڑھا سیاح حادثاتی طور سے بیچ میں آگیا۔

شہرام کی گاڑی گوٹھ کی طرف دوڑی چلی جا رہی تھی اور سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی نازاں ارد گرد کے ماحول میں جانے کیا کھوجتی ہوئی بیٹھی تھی۔

گوٹھ کی عورتیں آنگن میں جمع تھیں کہ آچر دوڑا آیا۔

"سائیں آگئے۔ مہمان بھی آئے ہیں"۔ تو گوٹھ کی عورتیں بڑی ماں کی جانب چلی گئیں۔ بالائی منزل کی کھڑکی سے جھانک کر صنم نے دیکھا تو اسٹریچر پر کسی کو لٹائے اندر لایا جا رہا تھا پھر وہ چاندنی میں آکر نیچے دیکھنے لگی۔ شہرام کے ساتھ وہ خوبصورت سی لڑکی اُن کے چہرے پر مسکان بکھر گئی۔ اور وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ کچھ دیر بعد قدموں کی چاپ ان کے دروازے تک آ ہی گئی اور شہرام کچھ کتابیں لیے اندر آگئے کتابیں میز پر رکھ کر بولے۔

"کوئی سیاح ہے۔ ہارٹ اٹیک ہوگیا تھا اُسے راستے میں۔ بیمار ہے اس لیے لے آیا ہوں۔ اس کے سامان میں یہ کتابیں ہی ملی ہیں۔"

صنم نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا تو وہ کھسیا کر بولا۔

"دوسری مہمان۔ میرا ہارٹ اٹیک ہے"

تو صنم ہنس پڑی۔

"اچھی ہے۔"

"آپ نے دیکھا" شہرام گھبرا گیا۔
"ہاں" صنم پھر ہنس پڑی تو شہرام گھبرا کر باہر نکل گیا۔
صنم نے کتابیں اُٹھالیں کہ اچانک نظر پڑی۔ "ڈاکٹر خالد" پہلی کتاب پر یہی نام اور پتہ لکھا تھا۔ وہ سن سی رہ گئی۔ ان کا سارا جسم پسینے میں نہا گیا، تو انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں وہ جو ایک شخص کہ ان کی زندگی تھا۔ آگیا۔
"میں آؤں گا، ضرور واپس آؤں گا۔ روحیں گواہ ہیں کہ میں یہاں پھر آؤں گا۔"
"یہ کتاب ان کی اپنی لکھی ہوئی تو تھی ہسٹری آف سندھ، 'سندھ ڈیلٹا' اور 'ڈیبل' یہ ساری کتابیں اُن کی اپنی ہی کتابیں تو تھیں۔ یہ ایرٹکٹ' یہ ٹریولر چیک چیخ چیخ کر اُسے جھنجوڑ رہے تھے کہ خالد آچکا ہے اس کے دروازے پر۔
وہ لپک کر آگے بڑھی اور اوطاق کی طرف کھلنے والے دریچے کا پردہ دھیمے سے ہٹا کر دیکھا۔ وہ سامنے ہی بیڈ پر لیٹا ہوا تھا وہی سرخ وسفید رنگت وہی موٹی موٹی آنکھیں۔ وہی بھاری بھر کم جسم، بال ضرور سفید ہوچکے تھے کہ عمر کا تقاضا جو تھا۔ چہرے پر زردی بھی چھا رہی تھی۔
اُس نے کلیجہ تھام لیا۔
"میں نے تمہیں کہا تھا خالد کہ بند دروازوں پر دستک نہ دو۔ دستک نہ دو۔"
ساری رات آنکھوں میں ہی کٹ گئی وہ بے حد پریشان تھی۔ ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ شہرام اور نازاں اوطاق میں مریض کے پاس ہی تھے، وہ کبھی پلنگ پر آکر بیٹھ جاتی کبھی بے تابانہ ٹہلنے لگتی۔ سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا کرے۔ تین بجے رات کو نازاں اپنے روم میں جاکر لیٹ گئی۔ شہرام خالد کے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے۔ صنم خالقِ حقیقی کے آگے سربسجود ہوکر گڑگڑا اٹھی "میرے مولی، میرے پروردگار مجھے ہمت عطا کر۔"
زینے پر آکر آچر کو آواز دی۔
"سائیں کو بلاؤ۔"
شہرام آئے تو بولی۔
"میں نے وظیفہ پڑھ لیا ہے۔ آپ اجازت دیں تو مریض کو دم کر دوں۔"
"ہاں! شاید اس طرح اس بے چارے کی مشکل آسان ہو جائے۔ میں بھی کچھ دیر لیٹ جاتا ہوں۔ آپ اوطاق چلی جائیے۔" شہرام اپنے کمرے کی جانب چلے گئے تو وہ اوطاق کی جانب بڑھ گئی۔

ڈاکٹر خالد کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ ہاتھ پاؤں کی طاقت جیسے ختم ہوتی جارہی تھی کہ اچانک جیسے روشنی در آئی آنکھوں میں۔ وہ سفید سایہ ہاں یہ وہی تو ہے۔ وہی ملکوتی مسکراہٹ۔ وہی معصوم چہرہ۔
"صنم" ان کے لب ہلے۔
صنم ہولے سے ان پر جھک گئی۔ جلتے تپتے ہونٹ ڈاکٹر خالد کی پیشانی پر رکھ کر وہ بول اٹھی۔
"خالد" اور اُن کے ہاتھوں کو تھام لیا۔ اور وہی مدہوش کرنے والا حُسن نیند بن کر اُن کی آنکھوں میں سماتا چلا گیا۔
"بالاچ! سائیں کو بلاؤ" بڑی ہمت کر کے انھوں نے کہا۔
شہرام دوڑے آئے۔ تو بالاچ نے سیاح کا چہرہ سفید چادر سے ڈھانپ دیا۔ صنم اندر جانے لگی تو سُنائی دیا۔
بالاچ کہہ رہا تھا "رئیسانی نے اچھا وظیفہ پڑھا سائیں۔ مہمان کی مشکل آسان ہوگئی۔"

پورا دن کفن دفن اور قرآن خوانی میں گزر گیا۔ (سندھ کے لوگ بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں) مہمان اور گوٹھ والے جا چکے ہیں۔ چہار سو سناٹا ہے۔ دور دور تک سیاہی کی ردا پھیل چکی ہے۔ دُور کہیں سے گیدڑ کے چلّانے کی آواز آرہی ہے۔ آسمان پر چکور کی آواز گونج رہی ہے اور وہ دریچے سے ٹکی پھٹی پھٹی آنکھوں سے حویلی کے قبرستان میں بنی اس نئی قبر کے سفید کُتبے کو تکے جارہی ہے جو اندھیرے میں بھی چمک رہا ہے۔ قبر پر بکھرے پھولوں کی خوشبو چہار سو پھیل رہی ہے اور آنسو ہیں کہ آنکھوں سے رواں ہیں۔
آج اس قبر کی تاریکیوں میں ایک ایسا شخص سو رہا ہے جو کچھ دن کو مہمان بن کر آیا اور رگ جان سے بھی قریب ہو گیا۔ اس شخص کی خوابناک آنکھوں نے اس کی حسین مورت کو نگاہوں ہی نگاہوں سے ہزار بار چوما تھا۔ جس کی ایک ہی دُعا تھی۔
عیسیٰ خان ترخان۔ خدا سے دعا کرنا کہ اگر اس کے ساتھ زندگی گزارنے کو نہ ملے تو اس کے در پر آخری پناہ گاہ تو ملے۔"
"خالد میں نے تو تم سے کہا تھا میری دنیا سے چلے جاؤ۔ تم پھر چلے آئے۔" "میں نے ہر جذبے کو تھپک تھپک کر سلا دیا تھا۔ زندگی کی ہر خوشی ہر مسرت پر اپنے دروازے بند کر لیے تھے۔ اپنے ہی حصار میں مقید زندگی گزار رہی تھی۔ تاکہ تمہاری یاد بھی میری ذات کے قلعے میں نہ در آئے۔ لیکن تم پھر میرے دروازے پر دستک دینے آگئے" پھولوں کی خوشبو کا جھونکا در آیا۔ ہوا تیز ہوگئی تھی۔ قبر پر پڑے پھول بکھر گئے تو صنم کا دل کانپ اُٹھا۔
"نہیں خالد نہیں۔ دستک نہ دو، دستک نہ دو۔"
اور دریچے کے پٹ بند کرتے ہوئے سر پٹخ کر رو پڑی۔

فرمانِ الٰہی

اور اگر تکلیف پہنچنے کے بعد آسائش کا مزہ چکھائیں تو (خوش ہو کر) کہتا ہے کہ (آہا) سب سختیاں مجھ سے دور ہوگئیں۔ بے شک وہ خوشیاں منانے والا (اور) فخر کرنے والا ہے (۱۰)
(سورۂ ہود)
ہاں جنھوں نے صبر کیا اور عمل نیک کیے یہی ہیں جن کے لیے بخشش اور اجرِ عظیم ہے (۱۱)
(سورۂ ہود)

۷۸۶
Hotel de Romana
ہوٹل ڈی رومانہ
دھلی میں آپ کا خیر مقدم کرتا ھے
★ دہلی و نئی دہلی کے سنگم پر واقع
★ جدید طرز پر تعمیر شدہ بلڈنگ
★ آرام دہ کشادہ کمرے ملحق باتھ روم
★ جزوی ایر کنڈیشنڈ
★ ہر کمرے میں ٹیلیفون اور میوزک کی سہولت
★ خوبصورت و دلکش نرم قالین کی سجاوٹ
★ ناشتہ و مغلئی کھانوں کا بہترین انتظام
★ عمدہ سروس، پاکیزہ ماحول، مناسب دام
★ خوش اخلاق مستعد اسٹاف آپ کی
★ خدمت کے لئے ہمہ وقت تیار
کم قیمت قیام کیلئے "ڈورمٹری" میں آرام دہ بستر بھی دستیاب ھیں
فون:
3266031-32-33
-34-35
3267131
منیجر ہوٹل ڈی رومانہ
نزد سبھاش پارک۔ جامع مسجد۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲ ۱۱۰۰
ہوٹل ڈی رومانہ میں قیام ــــ شان کے ساتھ گھر جیسا آرام

غزلیں

احتشام اختر

کے۔آر۔۲۴۳، سول لائنز، کوٹہ ۳۲۴۰۰۱، راجستھان

دشوار ہے بھلانا مزا اضطراب کا
منظر ابھی بھی یاد ہے مرگِ عقاب کا

پھاڑا مجھے تو سلسلہ پھر ٹوٹ جائے گا
میں بھی تو اک ورق ہوں تمہاری کتاب کا

لکھتا ہوں اس کا نام میں گھر میں جگہ جگہ
باقی ابھی خمار ہے کل کی شراب کا

میری صدا ہی گونجتی رہتی ہے دشت میں
میں منتظر ہوں اپنی صدا کے جواب کا

دیکھا تھا جس کو جھیل کے درپن میں ایک دن
آنکھوں کو انتظار ہے اس ماہتاب کا

خوشبو نے سُرخ پھول کی پاگل کیا مجھے
آنگن سے کاٹ پھینکا ہے پودا گلاب کا

فصیح اکمل

فلیٹ نمبر ٹی۔۶/۱ "بی" ونگ "سی بریز" کمپلکس کولی واڑہ، وسئی تھانہ ۴۰۱۲۰۱

صبح کے نام پر زہر کے جام ہیں روشنی کا سفر ہم سے کٹتا نہیں
رات بھی غم کے خوابوں کا اک سلسلہ بوجھ ایسا ہے دل پر کہ ہٹتا نہیں

آئینے فکر کے روپ بہروپ کے وقت سے پہلے کجلا دیے دھوپ نے
جسم جلنے لگے دل سلگنے لگے پھر بھی آتش فشاں کوئی پھٹتا نہیں

زندگی ظلمتوں میں تلاشِ سحر آس تک یاس کا اک انوکھا سفر
راہ میں سینکڑوں مرحلے ہیں مگر آخری سانس تک جی اُچٹتا نہیں

شام تنہائی کی رُت جواں کر گئی کتنے تاروں سے زخموں کے مُنہ بھر گئی
چاندنی رات کا آئینہ تو بنی چاند پر ابر وہ ہے کہ چھٹتا نہیں

رازداری کی حد تک تم آئے تو ہو اب اکیلے جو پلٹے تو یہ سوچ لو
خلوتوں نے جسے منتشر کر دیا محفلوں سے بھی وہ پھر سمٹتا نہیں

تو عروسِ غزل وادیٔ نجد سے ہیر رانجھا کی بستی تک آئی تو ہے
آگے اس گلشنِ عشق میں دیکھ کر مہماں گھر کی جانب پلٹتا نہیں

کرشن کمار طورؔ

ای/۱۳۴ کھنیارا روڈ، دھرم شالہ ۱۷۶۲۱۵

تجھ کو چاہا تھا کبھی اس کی نشانی تو رہے
میں رہوں یا نہ رہوں میری کہانی تو رہے

آ برس ٹوٹ کے مجھ پہ کسی بادل کی طرح
ریت کا دریا ہوں کچھ مجھ میں روانی تو رہے

منتقل کر دوں گا میں پھر سے نمو مٹی میں
میری آنکھوں میں لہو لہروں میں پانی تو رہے

ہاتھ سے ہاتھ ملائیں، دلوں سے دل جوڑیں
نئی دُنیا میں کوئی رسم پُرانی تو رہے

میں ترے وصل کا موسم بھی گزار آؤں گا
میری دہلیز پہ پہلے یہ جوانی تو رہے

اس لیے بھر دی ہے مانگ اس کی ستاروں سے طورؔ
کوئی دنیا میں مرے نام کا ثانی تو رہے
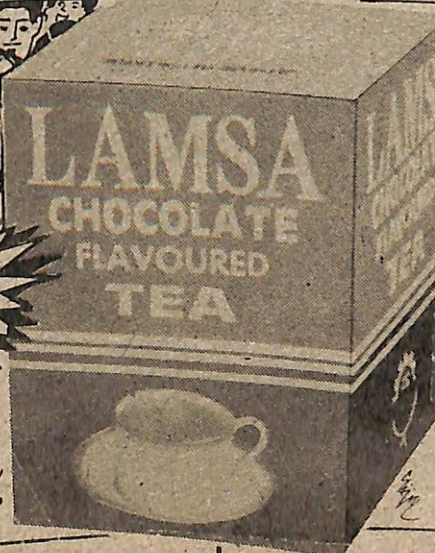
کھنڈر جاگ رہا ہے

ایم۔ کوٹھیاوی راہی

ایڈیٹر اشتراک ویکلی، قاضی پور خورد، گورکھپور، یوپی ۔ ۲۷۳۰۰۱

السّلام علیکم!

برادرِ محترم نیر صاحب!

بھئی خوب ملاقات ہوئی آپ سے۔ دلّی کا مشہور اشوکا ہوٹل، ملک بھر سے آئے اُردو مدیران جرائد و اخبارات کا پروقار ہجوم، جواں سال مرکزی وزیر سیاحت و شہری پرواز غلام نبی آزاد کے مہمان تھے۔ ہم سبھی مدیران جملہ اقسام! آزاد صاحب کا چنار رنگ چہرہ سب میں نمایاں، ایک دل پذیر شگفتگی و شیفتگی سے معمور، کھانا شروع ہونے سے پہلے مختلف موضوعات پر موصوف سے ہم سب کی بات چیت، خاکسار نے جناب کو، اور جناب نے خاکسار کو بہ نظر غائر دیکھا، تعارف چاہا، آپ زیرلب مسکرائے، خاکسار کے پوچھنے پر جناب نے جو اپنا نام لیا تھا پھر گرم جوشی سے مصافحہ کیا گیا، ہم ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے، آپ کا چہرہ خوبصورت نورانی داڑھی کی بدولت کسی فلسفی، کسی درویش کا چہرہ لگ رہا تھا۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ ادبی، کچھ دینی، کچھ سیاسی شب میں ریلوے کے وزیر جناب جعفر شریف کے دولت کدہ پر دعوتِ طعام میں ہم سبھی کو پہنچنا تھا اشوکا ہوٹل میں دو تین گھنٹے گزار کر ہم جدا ہوئے اور طے پایا کہ باقی باتیں وہیں ہوں گی۔ مگر آپ کو جانے کیا ہوا جو وہاں تشریف نہیں لائے، دوسرے روز آج کل کے دفتر میں محبوب الرّحمٰن فاروقی سے آپ کے سلسلے میں باتیں ہوئیں۔ وہیں سے فون کیا، مگر آپ سے بات نہیں ہوسکی۔

آپ کا

ایم۔ کوٹھیاوی راہی

بہت دن، بہت مہینے بہت سال
گئے۔ میں نے کہانیاں نہیں لکھی ہیں۔
ے اندر خاموشی کا دیو حلول کر گیا ہے
ں چپ ہو گیا ہوں۔
پھر ایک تارا ٹوٹا ہے اور آسمان کے
ندھیرے غار میں گم ہو گیا ہے۔ اسی طرح میں
بھی گم نہ ہو جاؤں۔ مجھے خدشہ ہے۔
مسجد کا اُجلا مینار کالا ہو گیا ہے۔
تھر کے زینوں پر اندھیروں کے بدن سو رہے
ں۔ میں چائے کی تلاش میں مسجد کے پاس
الے ہوٹلوں کو دیکھ رہا ہوں۔ سب بند
یں۔ بلا کی گرمی پڑ رہی ہے۔ ایک بھکاری
سجد کے سنگی زینے پر چت لیٹا پنکھا جھل
رہا ہے۔ بھکاری کا پنکھا بھی کالا ہے۔

خود بھی کالا۔ مسجد کے سامنے والا چھوٹا سا میدان بھی کالا۔ میں اس کالے ماحول سے کوسوں دور بھاگ جانا چاہتا ہوں۔

راپتی کے ساکت پانی میں تارے اُترے ہوئے ہیں۔ جیسے جا بجا نگینے جڑے ہوں۔ میں نے سگریٹ سلگا کر جلتی تیلی پانی میں اچھال دی ہے۔ میں مہینوں سے چپ ہوں۔ ایسا کیوں ہے۔ ایک بونے قد کی اُجلے بدن والی لڑکی نے میرا قلم چھین کر پھینک دیا ہے۔ اس قلم سے میں نے کتنی ہی کہانیاں لکھی تھیں۔ اس قلم نے ساری دنیا میں میری شہرتوں کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔ وہ قلم گم ہو چکا ہے۔ اور اس کی جگہ اس لڑکی نے لی ہے وہ خود قلم بن گئی ہے۔ مگر اس قلم سے کیا لکھوں؟ کتنا خوبصورت ہے یہ قلم! قلم گھستا بھی ہے۔ میں اُسے نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ اتنا حسین قلم میں نے کبھی نہیں دیکھا کہیں نہیں دیکھا۔ یہ قلم میری ملکیت ہے۔

اس قلم نے کہانیاں نہیں لکھنے دیں، ہاں اس قلم نے ایک گھر، ایک چھوٹا سا گھر بنایا آنگن، آنگن میں مہندی کا ایک سرسبز و شاداب پودا، ہرسنگھار کا ایک پیڑ معصوم سا ایک بچہ، اور میری گویائی جو کہانیوں کی خالق تھی، اس گھر، اس مہندی کے پودے اس ہرسنگھار کے پیڑ اس معصوم سے بچے میں کھو گئی۔

آپ سو رہے ہیں۔

ہاں، سو رہا ہوں۔

اٹھئے، سویرا ہو گیا۔
ابھی اُٹھتا ہوں۔
نہیں! اُٹھئے، جلد اُٹھئے
کتنی اچھی ہو تم!
وہ قلم مسکرا پڑا۔
ہٹئے، کوئی دیکھ رہا ہے۔
کون؟
ہرسنگھار۔
وہ نابینا ہے۔
مہندی کا پودا۔
وہ بھی نابینا۔

آئینہ

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں
(غالبؔ)

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں
(سیمابؔ)

مقابل قدِ آدم آئینہ ہے
بڑا دلچسپ مطلع لڑ رہا ہے
(شادؔ عارفی)

آئینے کے سامنے انگڑائیاں مت لیجئے
آئینے کو توڑ ڈالے گا خمارِ آئینہ
(مظفرؔ حنفی)

مرسلہ: لئیق احمد سلیم ——— منڈی بازار ورنگل

بچہ۔
ارے، اس کی نیند ٹوٹ گئی۔
دیکھئے نا۔
میں نے اُچک کر دیکھا۔ وہ آنگن میں کھیل رہا ہے۔
دیکھنے دو۔
ہٹئے ہٹئے، بچوں کی ذہانت کا آپ کو علم نہیں یہ کوئی گناہ تو نہیں!
میں نے قلم کو چوم لیا ہے بے ساختہ۔
قلم کی زلفیں بکھر گئی ہیں۔
قلم کا چہرہ گلنار ہو گیا ہے۔
پھر وہ قلم انگلیوں سے چھوٹ کر پہلو میں سما گیا ہے۔
ایسے میں کون بے وقوف ہو گا جو اُداس کہانیوں میں سر کھپائے گا۔
میں اب کہانیاں نہیں لکھوں گا۔
کیوں؟
میری کہانیاں اپنی منزل کو پا چکی ہیں۔
ایسا مت کہئے۔ آپ کہانیاں لکھیں گے اور بہت لکھیں گے۔ میں آپ کی ترقی چاہتی ہوں۔
اس قلم کی زبان کہے جا رہی ہے۔
کھیلتے ہوئے بچے کو ہرسنگھار کی جڑ سے نکل کر ایک کالے ناگ نے ڈس لینا چاہا ہے۔ ہوا آندھی بن گئی ہے۔ ہرسنگھار اکھڑ کر اڑ گیا ہے مہندی کا پودا بھی۔ پھر سیلاب چڑھ آیا ہے۔ گھر بھی ڈوب گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ خوب صورت قلم بھی۔
میں پھر سابقہ قلم کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ جس نے بے شمار شاہکار دیے جسے اس خوبصورت قلم نے چھین کر پھینک دیا تھا۔
آپ کیوں اُداس ہیں۔
یہ محض ایک خواب ہے۔
کیا؟
کہ تم میری شریکِ حیات ہو!
خواب مت کہئے۔ حقیقت ہے یہ۔
تم حد درجہ بے وقوف ہو۔
جی...؟
سوفی صد بے وقوف۔ تم میری شریکِ حیات نہیں ہو سکتیں۔ وہ آنگن، وہ گھر، وہ بچہ، خواب ہے، محض خواب۔
مایوس مت ہوئیے۔
میری کہانیاں آواز دے رہی ہیں تو لکھتے کیوں نہیں۔
تم کو پا کر لکھنا بھول گیا ہوں۔ کیونکر لکھا جاتا ہے نہیں معلوم۔ اب ایک لفظ بھی نہیں لکھ پاتا۔ سوچتا ہوں، جب تم چھن جاؤ گی تو کیا کروں گا۔
مجھے آپ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔
اچھا... تو، آؤ میرے ساتھ چلو۔
کہاں؟
جہاں ایک دوسرے کے ہو جائیں۔
ایسا کیسے کر سکتی ہوں؟
پھر اس قلم کی زبان گنگ ہو گئی۔
میں جھنجوڑنے لگا۔
اس نے اشاروں میں کہا۔
یہ کیسے ہو سکتا ہے؟
میں اسے فرش پر تنہا چھوڑ کر چلا آیا ہوں۔ میں نے ساکت ندی کے نگینوں میں پھر ایک جلتی تیلی اچھال دی ہے اور ریت پر لیٹ گیا ہوں۔ میں خواہشوں، لذتوں، قرب کی ریشمی ساعتوں والے ایک خوبصورت قلم کو پا کر، اس کھردرے قلم کو بھول گیا ہوں جس نے کتنے ہی اَن دیکھے گداز جسموں، آہوں، دل کو پاش پاش کر دینے والی کراہوں کا مجھے محبوب بنایا۔ میں اس "محبوب گر" قلم کی رفاقت کو کیوں بھولتا چلا جا رہا ہوں۔ میں ریت پر لیٹا فضاؤں میں دھواں اڑا رہا ہوں۔ میرا کلیجہ جل رہا ہے۔ آنگن ایک غار، ایک مہیب غار بن رہا ہے۔ بچہ ایک بوڑھے ابلیس کی طرح اس مہیب غار میں کھڑا قہقہہ لگا رہا ہے بوڑھے قد والی وہ لڑکی جو اس بوڑھے ابلیس کی جنم داتا ہے، نہ اچھی لگ رہی ہے، نہ خراب لگ رہی ہے۔ معلوم نہیں کیسی لگ رہی ہے میں یہ محسوس کرنا چاہتا ہوں۔!
اور مجھے محسوس ہو رہا ہے۔ وہ ایک بچہ گود میں لیے ندی کے نگینوں والے فرش پر اتر آئی ہے۔ بچہ رو رہا ہے۔ اتنے زور زور سے کہ میرے کانوں کے پردے ہلنے لگے ہیں۔
کہاں ہے وہ گھر!
کون سا گھر؟
جہاں مجھے لے جانے والے تھے۔
طوفان نے مٹا دیا۔
تو میں اب کہاں چلوں؟
آؤ میرے ساتھ۔
مگر میں اسے کہاں لے جاؤں۔
وہ طنزیہ ہنسی ہنستی ہے۔
کیا اس دن کے لیے اپنایا تھا؟

میں چپ ہوں۔
تمہارے کہنے پر گھر چھوڑا ہے۔
میں پھر چپ ہوں۔
اب میں کیا کروں۔ اس بچے کو کیا کروں؟
میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔
میں اسے دودھ کہاں سے دوں؟
میری جیب خالی ہے۔
نہیں جانتی تھی، اتنے غریب ہو!
میری انا کے وجود پر خشت باری ہونے لگی ہے۔

میں گڑگڑا رہا ہوں۔

میں پھر اکیلا ہوں، کوئی آواز، کوئی سوچ، کوئی آہٹ، کوئی دستک نہیں، ریت پر بکھرا ہوا ہوں، پیکٹ کا آخری سگریٹ بھی دم توڑنے والا ہے۔ صبح قریب ہے۔ میں نے طے کر لیا ہے سورج نکلنے پر کھردرے قلم کی تلاش میں نکلوں گا۔ پھر کہانیاں لکھوں گی پھر تنہا تنہا جیوں گا۔

یہ زندگی میری زندگی کے لیے نہیں ہے۔ کہانیوں کے لیے ہے اور کہانیاں اپنے لکھنے والے کی حیات نہیں ہوتیں۔ دوسروں کی حیات بنتی ہیں۔ یہ لذت، قرب، خواہشات اور ان کی تکمیل اوروں کے لیے ہے۔ ایک عام آدمی کے لیے۔ ایک مزدور، ایک کلرک، ایک حاکم کے لیے، اپنے لیے نہیں۔ اپنے لیے نہیں، اپنے لیے تو بس وہی تنہائیاں اور وہی ایک کھردرا قلم، مجھے یہ سوچ کر ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے سکون پا گیا ہوں۔

آج آپ پھر اداس ہیں۔
ہاں۔
وجہ پوچھ سکتی ہوں؟
نہیں۔
میں یہ اداسی ختم کر دینا چاہتی ہوں۔
میں اداس نہیں ہوں۔
یہ زلفیں بکھیر دوں۔؟
نہیں۔
آنچل؟
نہیں۔
قریب آجاؤں؟
جہاں ہو، وہیں بیٹھی رہو۔
آپ جو چاہیں کریں۔ آپ کے ساتھ چل سکتی ہوں، جہاں چاہیں لے چلیں جب چاہیں، جہاں چاہیں، جیسے چاہیں، منسلک ہو لیں۔ اب میرے لیے کوئی مجبوری نہیں۔
چکنے فرش پر پڑا ہوا تنہا قلم، وہ شوخ وہ حسین، وہ گلنار قلم، اچانک اداس ہو گیا ہے۔ شاید میری سوچوں کا اسے علم ہو گیا ہے، اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔

میں بہکنے لگا ہوں۔
کہانیاں آواز دے رہی ہیں۔
اس کے سر کو میں نے جھٹک دیا ہے۔
خفا ہو جاؤ۔
کیوں؟
وہ نہیں ہوں جو سمجھ رہی ہو۔ میرے خواب جو تم نے دیکھے ہیں، جھوٹے ہیں۔ ایک نکما آدمی ہوں، مگر جو بھی ہوں اپنے لیے ہوں۔ کسی اور کے لیے نہیں۔ تم مجھے پتھر کہہ دو۔
میں جا رہا ہوں۔
کہاں؟
معلوم نہیں۔
میں بھی چلوں گی۔
کہاں؟
معلوم نہیں۔
وہ زبردستی میرے ساتھ ہو گئی ہے۔
کہہ رہی ہے۔
آپ فن کار ہیں۔ آپ فن تخلیق کریں گے۔ میں آپ کے فن کی پرستار ہوں۔ پرستش کروں گی۔ آپ کو اب تک جو نہیں ملا وہ میں آپ کو دوں گی۔
تم کیا دے سکو گی۔؟
وہی۔ وہی۔
وہ زیر لب شرما سی گئی ہے۔
میرا دل دھڑک رہا ہے۔
وہ کہہ رہی ہے۔
وہی جو حوا جنت کے بعد آدم کو نہ دے سکی، میں دوں گی آپ کو۔ جنت سے نکل کر بھی جنت کی تخلیق ہو سکتی ہے۔ عارضی ہی سہی۔ کتنی ہی جنتوں کے خالق ہیں آپ۔ آپ ابھی اور کتنی ہی جنتیں تخلیق کریں گے۔ آپ تھک جائیں گے مگر میں آپ کو یہ محسوس بھی نہیں ہونے دوں گی، جہاں چاہیں، لے چلیے۔ میں آپ کا ساتھ دیتی رہوں گی۔ اب آپ کو تنہائی کا زہر ہرگز نہیں پینے دوں یہ بہت ظالم ہوتی ہے نا۔
تنہائی؟
میں نے پوچھا۔
ہاں۔
اس نے سسک کر جواب دیا۔

خواب

آنکھوں میں جو بھر لو گے تو کانٹوں سے چبھیں گے
یہ خواب تو پلکوں پہ سجانے کے لیے ہیں
(جاں نثار اختر)

وعدہ تو کر گئے تھے کہ آئیں گے خواب میں
مارے خوشی کے نیند نہ آئے تو کیا کروں
(حمیداللہ خاں)

ڈوبے مرے خوابوں کے جزیرے مرے آگے
چمکا مری قسمت کا ستارا مرے پیچھے
(مظفر حنفی)

میں ڈوبنے گیا تو کنارا پکار اٹھا
یہ خواب تو نہیں ہے یہ صاحب ادھر کدھر
(علوی)

مرسلہ: ارشاد احمد خان ـــ دمام سعودی عرب

یہ میرے دل کی آواز ہے۔
میری گزشتہ شب والی سوچوں کی آواز رک گئی ہے۔
میرے سینے سے چپکا ہوا قلم پھسل کر انگلیوں میں آگیا ہے۔ نصف شب کے نیم تاریک افق تلے، کھنڈر کے ٹوٹے لیمپ کے پاس، کھلے عارض و رخسار سے بے پروا، وہ سو رہی ہے۔ اور میں لکھ رہا ہوں اس کی اور اپنی بیتی تنہائیوں کی دکھتی داستان ایک لہو رنگ کہانی۔

سائبان

فریدہ زین

مکان نمبر۔ اے/۴۹-۵-۱۱، (فروزاں) ریڈہلس، حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۴

مکرمی مدیر صاحب!   آداب و نیاز

عرصہ دراز بعد "بیسویں صدی" کی بزم میں "سائبان" کے ساتھ حاضر ہو رہی ہوں طویل خاموشی پر معذرت خواہ ہوں۔

اگر اسے کسی قریبی شمارے میں جگہ دے دیں تو مناسب ہوگا۔ افسانے پر آپ کی گراں قدر رائے اور قارئین کی آرا کا انتظار رہے گا۔

"سائبان" ایک پناہ گاہ ہے تحفظ کا احساس اگرچہ اس میں نہیں۔ مگر فلکی کا حوصلہ دیکھئے۔

جواب کی منتظر رہوں گی۔

مخلص
فریدہ زین

سائبان — جس کا نہ کوئی در ہے نہ دیوار نہ دریچہ۔

ایک کھوکھلی پناہ گاہ جو تحفظ نہیں دے سکتی۔ سردیوں کی یخ بستہ رات ہو یا گرمیوں کی جھلسا دینے والی لُو یا پھر طوفان کے تیز جھکڑ۔

مکان اور سائبان میں بہت فرق ہوتا ہے۔ انسان مکان میں خود کو محفوظ سمجھتا ہے کم سے کم جانور نما لوگ تو اندر نہیں گھس سکتے۔ سائبان میں تو چاروں طرف سے حملے کا اندیشہ رہتا ہے۔

اب وہ سائبان میں ہی تو رہنے لگی تھی۔ مکان تو کب کا ٹوٹ چکا مکین ہی نہ رہے ماں تو بچپن سے شباب کی طرف آتی ہوئی فلکی کو نظر بھر کر بھی دیکھ نہ پائی کہ نظر بند ہوگئی۔ لے دے کے ایک باپ ہی تو رہ گیا تھا۔

کیسے عیش کے دن تھے وہ۔ اس کے چہرے پر تھوڑی سی ناگواری کے آثار بھی نظر آتے تو ماحول موسم کی طرح بدلنے لگتا۔ پپا کو فکر لاحق ہو جاتی۔ نوکر چاکر اس کے اردگرد منڈلانے لگتے۔ وہ شان بے نیازی سے حکومت کر رہی تھی نہ کسی انقلاب کا خوف تھا اور نہ کسی دشمن کی خفیہ سازشوں کا خدشہ وہ تھی اور اس کی بے نیازیاں، مگر اسے کیا پتہ تھا کہ قسمت بھی کبھی کسی مکار ساتھی کی طرح دغا دے جاتی ہے۔

ناز و نعم میں پلنے والی فلکی کو دھیرے دھیرے احساس ہونے لگا کہ زندگی خوشگوار ہوا کا جھونکا نہیں بلکہ تپتی دوپہر میں ریت پر چلنے کا نام ہے۔

پپا کا بزنس زوال آمادہ ہو گیا۔ گھر کے حالات بدلنے لگے۔ آسائش کی گھڑیاں اڑنے کو پر تولنے لگیں۔ ملازمین کی تعداد گھٹنے لگی۔ کپڑوں لتوں میں انحطاط آگیا ضروریات زندگی سمٹنے لگیں۔ پپا کی صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ قرض کا بوجھ بڑھ رہا تھا۔ آخر ایک دن انھوں نے فلکی کو قریب بلایا۔

"فلکی! بیٹی میں تجھے لفظوں کے کچے دھاگے میں نہیں باندھوں گا۔ میرے جیتے جی اگر تو حقیقت کی چٹانوں سے ٹکرانے کی ہمت پیدا کر لے تو میں سکون سے مر سکوں گا۔ میرے خواب ریت پر قدموں کے نشان کی طرح مٹ گئے۔ میری خواہشیں کینسر کے مریض کی طرح آہستہ آہستہ دم توڑ رہی ہیں۔ لاکھ کوشش کے باوجود میں تجھے زندگی کے سرسبز و شاداب گلستان کی سیر نہیں کروا سکتا۔ تیرے لیے زندگی ایک صحرا ہے، بیابان ہے۔ شاید میرے بعد مکان بھی سائبان بن جائے۔ ہمت اور حوصلے کے پتوار کو تھام کر زندگی کے طوفان میں ناؤ کھیتی چلی جا۔" ان کی آواز بھرّا گئی جیسے پیمانہ لبریز ہو گیا ہو۔

یہ دولت بھی عجیب شے ہے، شاید اس سے بڑھ کر بے وفا کوئی نہ ہو۔ کبھی کسی کی رفیق بن جاتی ہے تو کبھی کسی کی رقیب، مگر لگتی سبھی کو پیاری ہے حسین اتنی کہ جس کے گلے لگ جائے دنیا کا سارا عیش سمیٹ کر اس کے قدموں میں ڈال دے اور بدصورت اتنی کہ اگر کسی سے دور ہو جائے تو آدمی کو خودکشی پر مجبور کر دے۔ اس کے باوجود دنیا کی آرزو اور تمنا بن کر ماحول کو منتشر کر رہی

ہے۔ اس ایک لفظ میں سمٹی کئی داستانیں بکھری پڑی ہیں۔

فلکی کو پستی کی طرف آنا پڑا۔ اس نے ایک کمپنی میں ملازمت کر لی۔ عروج سے زوال کا زمانہ ذہنی انتشار کا ہوتا ہے۔ ارتقاء کی کوئی صورت نظر نہیں آتی بجھے بجھے سے لمحے۔ یادوں کے قافلے آدمی کو انقلابات سے دوچار کر دیتے ہیں۔

فلکی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ایک ایک کر کے زندگی کی قدریں ٹوٹتی گئیں۔ حالانکہ اس نے پیا کے جملوں کو لاٹھی سمجھ کر سنبھال لیا تھا مگر پھر بھی وہ انسان تھی۔ احساسات اور کیفیات کا پیکر۔

مجبوری کے صبر آزما دنوں میں جب وہ باہر نکلی تو اس نے محسوس کیا کہ کھلے آسمان اور پھیلی ہوئی زمین کے درمیان وہ ایک سوکھے پتے کی طرح خلاؤں میں اڑ رہی ہے۔ کہیں ہوسناک نگاہیں، کہیں پُر فریب باتیں۔ کہیں جھوٹی تسلیاں اور کہیں عارضی التفات۔ وہ سب کچھ سمجھتی تھی اور خود کو بچا کر سنبھال کر یوں رکھ لیتی جیسے لٹیروں کی بستی میں آ گئی ہو۔

ان حالات میں اس کی ملاقات ثاقب سے ہوئی جو اسی کمپنی میں منیجر تھا فلکی نے اپنے وجود کی تمام تر رعنائیوں کو جو حالات کی ضرب سے ریزہ ریزہ ہو رہی تھیں۔ سمیٹ کر ثاقب کے سامنے پیش کیا تو اس نے غیر محسوس طریقے پر فلکی کو اپنے دل کے فریم میں بٹھا لیا۔

"مس فلکی آج سے آپ میری سکریٹری رہیں گی۔"

"جی۔ جی بہت اچھا" وہ بوکھلا گئی اور پھر وقت کے پرندے نے اپنے پر پھیلا دیے۔

فلکی جو حالات کی ستم ظریفی کا شکار تھی ثاقب کے سنجیدہ التفات پر مسحور ہو گئی اور ثاقب تھا بھی اتنا وفادار کہ اس نے فلکی کو اس کی کم مائیگی کا احساس بھی نہ ہونے دیا۔ ریشم کا ایک مہین سا پردہ دو دلوں کے درمیان تھا۔ کوئی بھی اسے سرکانے کی کوشش نہ کر سکا کہ مبادا کہیں انا کو ٹھیس پہنچے مگر پھر بھی ایک دن ثاقب نے اظہار کر ہی دیا۔

"فلکی۔ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو دل چاہتا ہے پہروں تمہارے ساتھ رہوں۔"

"مم... مگر... میں تو ایک معمولی سی"

قبل اس کے کہ وہ اپنا جملہ مکمل کرتی ثاقب نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میرے خیالات میرے اپنے ہیں میں نے تم سے رائے نہیں مانگی۔ اس لطیف احساس سے مجھے گزر جانے دو۔ میں مسرور بھی ہوں اور مطمئن بھی۔" ثاقب کے اس جملے نے فلکی کے لبوں پر خاموشی کی مہر لگا دی مگر دل میں ہلچل مچا دی۔

"ثاقب" "ثاقب" "ثاقب"۔

ایک نام ایک آواز۔ ایک گونج۔ درد کی لکیر کی طرح فلکی کے وجود میں جانے کہاں تک کھنچ گئی تھی۔ ایک خاموش کسک کے ساتھ ثاقب اس کے نہاں خانے میں آباد ہو گیا اور اپنے وجود کے جگنو سے اس کے دل میں روشنی بکھیرنے لگا۔ وہ اس روشنی کے سہارے اندھیری راہوں پر چلنے لگی۔

معاش کی تلاش نے فلکی کو زندگی کے سارے تلخ تجربے سکھا دیے اُس نے اپنے آپ سے سمجھوتہ کر لیا۔ مجبوریاں انسان کو باغی بنا دیتی ہیں یا پھر منکر

ثاقب نے اُمیدوں کے ننھے ننھے دیے جلا کر اس کے تخیّل کی دنیا آباد کر دی وہ خوابوں کے جزیرے میں مست خرام ہو گئی اس نے حالات کا شکوہ کرنا چھوڑ دیا۔ ایک آس، ایک اُمید اس کی زندگی میں سانسوں کی طرح شامل ہو گئی۔

"ثاقب نہ ہوتے تو کیا ہوتا" وہ پیا کی گرتی ہوئی حالت کو دیکھ کر سوچتی۔ کتنی ہمت دلایا کرتے تھے ثاقب۔ پیا کو بھی تو

تسلی تھی، مگر فلکی اتنی خوددار بھی تھی کہ اس نے تحفے کے نام پر ثاقب سے کبھی کوئی خیرات نہیں لی۔ وہ محبت کو دولت کے ترازو میں تولنے کی قائل نہیں تھی کیونکہ محبت تو از خود ایک دولت ہے۔

ایک شام جب فلک کے ماتھے کی بندیا ڈوب رہی تھی پپا کی سانس ٹوٹ گئی ایک زلزلہ آگیا۔ اس کا دل دہل گیا آنکھیں فریادی بن گئیں اور زندگی ایک سوال ــ ؟

فلکی سوچتی رہی۔ پپا نے کتنی بے رخی سے منہ موڑ لیا۔ یہ موڑ بھی بڑے بے درد ہوتے ہیں۔ راستوں کے موڑ راہی بدل دیتے ہیں، درد کے موڑ دامن بھگو دیتے ہیں اور زندگی کے موڑ حالات بدل دیتے ہیں۔

پپا کی موت کے بعد فلکی کو گھر بھی چھوڑنا پڑا۔ قرض اتنا کچھ تھا کہ مکان فروخت کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ ایک چھوٹا سا کمرہ اس نے کرایے پر لے لیا اور اپنی پوری کائنات اسی میں سمیٹ لی۔ زندگی کی صعوبتوں سے گزرتی فلکی ثاقب کو ایک مضبوط ستون سمجھ رہی تھی، مگر یہ ستون بھی اس وقت گر گیا جب ثاقب نے اس کے وجود کو مجبوری کے بارود سے اُڑا دیا۔

"فلکی ۔ میں ۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" فلکی صرف دیکھتی رہ گئی۔

"کیسے کہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔"

ثاقب جملوں کو تلاش کر رہا تھا۔ فلکی کے ذہن میں اندیشوں نے جھانکا کیونکہ وہ ثاقب کے اُڑتے ہوئے رنگ کو سمجھ رہی تھی۔

"ثاقب خود کو معمہ اور مجھے پہیلی نہ بناؤ۔ مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ سچ کا سامنا کر سکوں۔ میں خود تم سے ایک سوال کرنا چاہتی ہوں۔" دفعتاً فلکی نے پوچھا۔

"مطلب ـ" ثاقب کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

"سیدھی سی بات ہے۔ مجھے اپنے وعدوں کا حساب دے دو۔ میں اس ہجوم تنہائی سے گھبرا گئی ہوں۔" فلکی نے کہہ ڈالا۔

"مم ... میں تمہارے ساتھ ہوں فلکی ـ" لفظ ٹوٹ رہے تھے۔

"ہاں یقیناً تم میرے ساتھ ہو۔ آنکھ میں نور کی طرح، دل میں دھڑکن کی طرح مگر ... مگر ..."

"مجھے معاف کر دینا۔ ڈیڈی نے مجھے بیچ ڈالا۔" ثاقب رُک گیا۔

"بیچ ڈالا۔ کیا مطلب۔" فلکی حیرتوں میں ڈوبنے لگی۔

"ہاں فلکی۔ ڈیڈی کے دوست کا بہت بڑا بزنس ہے اور ڈیڈی نے اس کی پارٹنرشپ مجھے دلوادی ہے اور اس کے بدلے میں اُن کی لڑکی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں ڈیڈی کے غصے سے واقف ہوں۔ میں مجبور ہوں۔" آخرکار سچائی کا سامنا فلکی کو کرنا ہی پڑا۔

"اچھا" وہ ایک لمبی سانس کھینچ کر رک گئی۔

"مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں مجبور ہوں میں تو تمہیں دل سے پیار کرتا ہوں۔"

"نوازش، عنایت۔ بڑے حوصلہ مند ہو اور بے خوف بھی۔ بڑی وسعت ہے تمہارے دل میں۔" جانے فلکی میں اتنا ٹھہراؤ کیسے آگیا۔

"مجھے غلط نہ سمجھو۔"

"نہیں ۔ میں تو خود غلطی پر تھی بھول تو مجھ سے ہوئی۔ تم کمپنی کے منیجر اور میں ایک معمولی کلرک۔ بھلا کیا میل تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ تم اس وقت مجھے ملے جب میں شدید طور پر زخموں سے کراہ رہی تھی لفظوں کا مرہم دے کر تم نے میرے زخم بھر دیے اور میں ۔ میں پاگل۔ تمہاری ہمدردی تمہارے رحم کو جانے کیا سمجھ بیٹھی۔"

"مجھے معاف کر دو فلکی میں شرمندہ ہوں۔" ثاقب کا جواب بے جان سا تھا۔

"بس کیجیے ثاقب صاحب۔ اس افسانے کو یہیں ختم کیجیے۔ بڑی آسانی سے آپ نے دل کی سرحد پار کر لی، لیکن نہیں سوچا کہ آرزوؤں کی رہ گزر سونی ہو جائے گی۔ تمناؤں کی بستی اُجڑ جائے گی۔ امید کی دنیا لٹ جائے گی۔ شاید۔ شاید آپ کے پاس احساس کا کوئی مقام نہیں، چلو اچھا ہوا۔ آزاد کر دیا تم نے۔ دل کے مکین تو بن گئے مگر میرے لیے مکان کے بجائے سائبان دے دیا تم نے۔ یقین، اعتماد اور بھروسے کے سارے گھروندے توڑ ڈالے تم نے۔" فلکی کے صبر کا بندھ ٹوٹ گیا۔

"ایسا نہ کہو فلکی۔ میں تمہارا ساتھ ضرور دوں گا۔" ثاقب کے لہجے میں التجا تھی۔

"مجھے اپنا دوست سمجھو مجھ سے وفا کی امید رکھو۔"

"ثاقب صاحب! وفا کے انمول موتی محبت کے سمندر میں، چاہت کی گہرائیوں میں جذبات کی سیپ میں بند رہتے ہیں۔ انھیں حاصل کرنے کے لیے پیراکی سیکھیے۔ اور ہاں، جذبے کو کشکول سمجھ کر کھوکھلے لفظوں کی خیرات اس میں مت ڈالیے۔ آپ کا یہ التفات میں اپنے لیے ایک گالی سمجھتی ہوں۔ جائیے، یہاں سے چلے جائیے یہ رہ گزر ہے آپ کی منزل نہیں۔" فلکی نے دروازہ بند کر لیا۔

شام کا تھکا ماندہ سورج اپنی پناہ گاہ کی طرف رواں تھا۔ مؤذن کی اذان نے خدا کی عظمت کا احساس دلایا اور وہ سجدہ ریز ہو گئی۔

"اے مالک حقیقی میں سائبان میں ضرور ہوں مگر تیری پناہ چاہتی ہوں تو میرا محافظ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تیرے اس پھیلے ہوئے سائبان کے نیچے سبھی پناہ گزین ہیں۔" اور پھر جیسے اس کے دل کو قرار آگیا ایک مضبوط سہارا مل گیا۔

اب بھی فلکی سائبان ہی میں رہتی ہے نہ کسی نے دیوار اُٹھائی نہ کسی نے دریچہ کھلوایا۔ لوگ آئے اور چلے گئے۔ کوئی جگہ پُر نہ ہو سکی۔

فلکی کے چہرے پر وقت کی گرد نے کوئی تہہ نہیں چڑھائی بلکہ اس کے چہرے پر آج بھی مریم کی پاکیزگی اور زلیخا کی وفا کا نور جھلک رہا ہے۔ ●●

غزلیں

شفیع اللہ خاں رازؔ اٹاوی

کٹرہ پوردل خان، اٹاوہ ۲۰۶۰۰۱، یوپی

تو اگر میرے ساتھ ہو جائے
رشکِ جنت حیات ہو جائے
وقت اِک بے وفا حسینہ ہے
جانے کب کس کے ساتھ ہو جائے
چاہتے ہو یہ امن کی بستی
مرکزِ حادثات ہو جائے
حُسنِ کردار میں وہ برکت ہے
آدمی کی نجات ہو جائے
ہم اسی آرزو میں زندہ ہیں
جانے کب تیرا ساتھ ہو جائے
آدمی، آدمی نظر آئے
ختم گر ذات پات ہو جائے
رازؔ، فرصت میں گر وہ مل جائیں
اُن سے کچھ دیر بات ہو جائے

علی عرفانؔ زیدی بدایونی

حضرت عروج زیدی روڈ، محلہ کٹ کوئیاں، رامپور ۲۴۴۹۰۱

کچھ راس زمانے کی ہوا ابھی نہیں آتی
اور کچھ ہمیں جینے کی ادا بھی نہیں آتی
کیا گزری ہے زنداں کے اسیروں پہ عزیزو
زنجیر کھڑکنے کی صدا ابھی نہیں آتی
چھوکر ترے جلووں کو بھلا اور کہاں جائے
نظروں میں تو اب جیسے ضیا بھی نہیں آتی
دل جب سے ترے غم کا پرستار ہوا ہے
ہم تک غمِ دنیا کی ہوا بھی نہیں آتی
شاید کہ بہت دُور گیا قافلۂ شوق
اب کانوں میں آوازِ درا بھی نہیں آتی
وہ پھول ہوں کیا خاک بہاروں کی ضمانت
جن پھولوں سے خوشبوئے وفا بھی نہیں آتی
ہمسائے کا گھر اتنا فلک بوس ہے عرفاںؔ
کیا دھوپ، مرے گھر میں ہوا بھی نہیں آتی

گوہرؔ شیخ پوری

۲۸/۳۸ تیلیا باغ، بنارس ۔ ۲۲۱۰۰۲

یہ کیا ہر اِک نظر سے جو پنہاں دکھائی دے
زاہد کو وہ قریبِ رگِ جاں دکھائی دے
موسم کا ہے اثر کہ نگاہوں کا ہے قصور
صحنِ چمن بہار میں زنداں دکھائی دے
اشکوں کا میرے تم پہ نہیں کیوں کوئی اثر
مجھ کو تو قطرے قطرے میں طوفاں دکھائی دے
کھولیں زبان خورد تو الزامِ سرکشی!
لیکن اگر خطائے بزرگاں دکھائی دے؟
سب کی روش ہے ایک وہ ہوں پارسا کہ رند
حمّام میں ہر ایک ہی عُریاں دکھائی دے
حیوانیت کی گرد میں پنہاں ہے آدمی
چھٹ جائے یہ غبار تو انساں دکھائی دے
لایا ہے عشق اب مجھے ایسے مقام پر
گوہرؔ جہاں سے گورِ غریباں دکھائی دے

طاہرؔ تلہری

صدر بازار، پوسٹ تلہر، ضلع شاہجہانپور ۔ ۲۴۲۳۰۷

آبادیوں کے شور شرابے میں آگیا
صحرا سمٹ کے شہر کے نقشے میں آگیا
اے مرگِ ناگہاں تو کہیں اور جا کے مر
تیرا تو ہر مزا ہمیں جینے میں آگیا
منڈلا رہا ہے ڈوبنے والے کے آس پاس
جانے کہاں کا حوصلہ تنکے میں آگیا
ہر ہر نفس حوادثِ نو کا ہے سامنا
اے زندگی میں کیوں ترے کہنے میں آگیا
جب تیرے نیک بندوں نے ٹھکرا دیا مجھے
تنگ آکے پھر گناہ کے کوچے میں آگیا
اُبھرا کبھی نہ قلزمِ حیرت میں ڈوب کر
جو زندگی کے آئینہ خانے میں آگیا
پیہم ریاضِ فن کا ہے طاہرؔ یہ ماحصل
اِک خاص بانکپن مرے لہجے میں آگیا

بابی ڈول

زین العابدین خاں

رضوی بلڈرس، رضوی ہاؤس، ہل روڈ، باندرہ، ویسٹ بمبئی ۴۰۰۰۵۰

مکرمی تسلیمات!

بابی ڈول حاضرِ خدمت ہے۔ دیکھئے اس حسین گڑیا میں کتنے آنسو چھپے ہوئے ہیں۔ گڑیا اور عورت دونوں کھیلنے کی چیز ہے۔ ایک سے بچّہ کھیلتا ہے اور دوسرے سے مرد، لیکن ہر عورت گڑیا نہیں، کبھی کبھی مرد کو روئی کی طرح دُھن دیتی ہے اور اپنے راستے سے غبار کی طرح اڑا دیتی ہے۔

آپ کا

زین العابدین خان

وہ دن بڑا عجیب تھا کرنل مصرا نے مجھے بلایا اور کہا "خاں صاحب! آپ صوبیدار غلام رسول کو جانتے ہیں؟"

میں نے کہا "جی ہاں"

"تو فوراً ڈاکٹر ظہیر احمد کے پاس جائیے انھیں آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔"

میں راستے بھر سوچتا رہا کہ آخر وہ کون سی بات ہوگی جو ڈاکٹر صاحب کو مجھ سے کرنی ہے۔ صوبیدار غلام رسول سری نگر کا رہنے والا ہے وہ ایک کشمیری مسلمان ہے اور میں ایک بہاری نہ زبان کا تال میل اور نہ ہی کوئی قرابت داری۔ بس کسی پارٹی میں مل گئے تو علیک سلیک ہوگئی اس کے علاوہ کوئی خاص رغبت نہیں تھی، ہاں ایک بات ضرور تھی کہ اُن کی بیوی شبنم ہماری فوجی کالونی کی سب سے خوبصورت عورت تھی۔ جب وہ دو چار ماہ سری نگر رہ کے آتی تو بالکل گلاب کی طرح کھل جاتی۔ لمبا قد، گورا بدن، لمبے لمبے گیسو، بھرا بھرا بدن اور بڑی بڑی آنکھیں، اور پھر سارے فوجیوں کی نگاہیں اُسے گھورنے لگتیں۔ سب سے پہلی بات جو میرے ذہن میں آئی وہ یہ کہ کہیں شبنم کی خوبصورتی کو کسی نے ہاتھ تو نہیں لگا دیا۔ اگر مان لیجئے کسی نے اس پھول کو چھو دیا تو اس کا ڈاکٹر سے کیا مطلب؟ آخر مجھے ڈاکٹر صاحب نے کیوں بُلایا ہے۔ میں اسی ادھیڑ بن میں اُلجھا اُلجھا سا ملٹری اسپتال پہنچا اور ڈاکٹر صاحب کو سیلوٹ کر کے ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"یس آئیے صوبیدار میجر خان۔"

"سر! کیا مجھ سے کچھ غلطی ہوگئی؟"

"نہیں: پر کچھ انہونی ہو رہی ہے۔ میں نے صوبیدار غلام رسول کی بلڈ رپورٹ دیکھی ہے انھیں پیلیا نہیں بلکہ بلڈ کینسر ہے اور وہ مشکل سے ہفتہ بھر کے مہمان ہیں۔ انھیں میں کمانڈ ہاسپیٹل بھیج رہا ہوں، لیکن یہ بات راز میں رہے صرف اُن کی بیوی کو چپکے سے بتا دینا اگر نہ بتا سکو تو انھیں میرے پاس بھیج دینا۔"

میرے پاؤں تلے زمین کھسکنے لگی اور مجھے چکّر آنے لگا۔ اچھا بھلا انسان ہم سب میں قد آور جوان اُسے بلڈ کینسر کیسے ہو سکتا ہے ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

"اس کے بچّے کتنے ہیں۔؟"

"سر! دو، ایک پندرہ سال کا لڑکا اور دوسری چھ سال کی بچّی۔ لڑکے کا نام ساجد اور لڑکی کا نام صوفیہ ہے۔"

"مائی گاڈ۔"

اس کے بعد میں غلام رسول کے گھر کی جانب چل پڑا۔ جب میں غلام رسول کے گھر پہنچا تو سب کچھ نارمل تھا۔ یہاں کسی کو معلوم ہی نہ تھا کہ ان کے گھر میں موت اپنا کالا سایہ کیے ہوئے ہے۔ صوبیدار غلام رسول اپنی لاڈلی بیٹی صوفیہ سے کھیل رہا تھا ہاں ذرا سا کمزور ہو گیا تھا۔ آنکھیں پیلی تھیں اور ساجد اسکول سے آ کے کھانا کھا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی غلام رسول خاص کشمیری انداز میں خوشی سے چلّا پڑا۔

"السلام علیکم۔ خوش پوٹھ۔ ارے جناب کیسے راستہ بھول گئے۔"

"یار راستہ نہیں بھولا۔ بس یونہی ادھر سے گزر رہا تھا سوچا کشمیری چائے پی لوں۔"

"کشمیری چائے تو یوں کہئے۔" اور اس نے بڑے چاؤ سے اپنی بیوی شبنم سے کشمیری چائے لانے کو کہا۔ کشمیری کبھی خالی چائے کسی کے سامنے نہیں رکھتے۔ ڈھیر سارے بسکٹوں کا تھال سامنے رکھ کے ضد کریں گے کہ ہر بسکٹ کا ذائقہ چکھئے۔ ٹھیک وہی ہوا۔ میں کھاتا رہا اور چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ ہندوستان کے ہر صوبے میں مہمان نوازی ہوتی ہے لیکن کشمیری لوگ مہمان نوازی میں سب سے آگے ہیں۔ وہ اپنے مہمان کو اتنا کھلا دیتے ہیں کہ دوسرے

فرمانِ الٰہی

اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے نعمت بخشیں پھر اس سے اس کو چھین لیں
تو ناامید (اور) ناشکر (ہو جاتا) ہے ⑨ (سورۂ ہود)

وقت کھانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ۔
میں غلام رسول کو زندہ دیکھ رہا تھا وہ مجھ سے باتیں کر رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ سات آٹھ دن کے بعد یہ مرجائے گا۔ اس کی بیوی بیوہ ہو جائے گی اور اس کے بچے یتیم۔ صوفیہ جو چھ سال کی بچی تھی غلام رسول کے سینے پر چڑھی اس کی مونچھیں مروڑ رہی تھی اور وہ ہنسے جا رہا تھا ہنستے ہنستے اُس نے کہا۔
" بھائی صاحب میری صوفیہ کا روز ہی برتھ ڈے ہوتا ہے ۔"
" وہ کیسے ؟ " میں نے پوچھا۔
" جب کالونی میں کسی بچے کا برتھ ڈے دیکھتی ہے تو مجھ سے ضد کرنے لگتی ہے ۔ پاپا میرا برتھ ڈے مناؤ۔ اس بار یہ ضد کر رہی ہے کہ برتھ ڈے پر باربی ڈول گفٹ لوں گی ۔"
اسی بیچ صوفیہ اپنی چھوٹی چھوٹی کلائیوں کو گھماتے ہوئے بولی " پاپا باربی ڈول بولتی ہے ناچتی ہے اور گیت بھی گاتی ہے ۔"
" ٹھیک ہے ٹھیک ہے اس بار تمہاری برتھ ڈے پر باربی ڈول لا دوں گا ۔"
" پاپا پرامز ۔"
" ہاں بھئی پرامز ۔"
صوبیدار غلام رسول ہنستے رہے صوفیہ ہنستی رہی، ساجد ان کا لڑکا ہنستا رہا اور اُن کی بیوی شبنم بھی ہنستی رہی، لیکن میں اندر ہی اندر روتا رہا کہ غلام رسول ایک ہفتے کے بعد منوں مٹی کے نیچے ہوگا اور یہ لوگ روتے ہوں گے ۔ میں کچھ نہ کہہ سکا اور چپ چاپ وہاں سے چلا آیا۔
دوسرے دن ڈاکٹر نے اشاروں کنایوں میں شبنم کو سب کچھ سمجھا دیا اور شبنم سنتے ہی بکھر گئی۔
ایک دن اس نے مجھ سے کہا " بھائی صاحب ! زندگی ایک بازی کی طرح ہے ہار جیت تو ہمارے ہاتھ میں نہیں پر بازی کا کھیلنا ہمارے ہاتھ میں ہے اور میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس بازی کو کھیل رہی ہوں ۔"
جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ صوبیدار غلام رسول سے میرے تعلقات بہت کم تھے البتہ ان کی سب سے اچھی دوستی صوبیدار اشرف سے تھی۔ صوبیدار اشرف حسن پرست تھے، جس کی بھی بیوی خوبصورت ہوتی۔ اس کے گھر میں وہ ضرور گھس جاتے تھے۔ پہلے سلام دعا اس کے بعد دعوتیں پھر تحفہ تحائف کا سلسلہ شروع ہو جاتی ۔ کچھ عورتوں پر انھوں نے دست درازی بھی کی لیکن بُری طرح ذلیل کیے گئے۔ لیکن چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے کے مصداق وہ صوبیدار غلام رسول کی بیوی شبنم کو دن بھر نہارتے رہتے کبھی بچوں کے لیے بسکٹ کبھی ٹافی ضرور لاتے۔ بچے خوش تو بچوں کی ماں بھی خوش۔
غلام رسول کی موت آنی تھی آئی چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ صوفیہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ لوگ کیوں رو رہے ہیں ؟ کیوں اس کے پاپا سفید کپڑوں میں ملبوس ہیں۔ ساجد کو پتہ چل گیا تو پاگلوں کی طرح سب کو گھورنے لگا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کہا " انکل میرے پاپا کو زمین میں نہ گاڑنا۔ مجھے ایسا کریں کہ پاپا یونہی آسمان میں اُڑ کے چلے جائیں ۔"
میں کیا جواب دیتا اپنے آنسوؤں کو رومال میں چھپا لیا۔
شبنم کے اوپر جب مصیبت کا پہاڑ ٹوٹا تو ایک وجود پہلے ہی سے گھر میں موجود تھا دھیرے دھیرے گھر کے سارے کام کاج کرنے لگا۔ کالونی میں ایک عجیب سا سکوت چھا گیا۔ کئی فوجیوں نے برجستہ اشرف کو ٹوکا بھی کہ اب غلام رسول کے گھر نہ جایا کرے لیکن وہ تو کتے کی دم تھے۔ ٹیڑھے کے ٹیڑھے رہے۔ اب تو کبھی کبھی شبنم کے حسن کی تعریف بھی کر دیا کرتے تھے۔ اور شبنم بھی اپنا خیال رکھنے لگی تھی۔
ساجد کو سب سے زیادہ فکر صوفیہ کے برتھ ڈے کا تھا۔ اس کا برتھ ڈے بہت قریب تھا۔ اور کسی طرح وہ اُسے باربی ڈول تحفے میں دینا چاہتا تھا کہ موت سے پہلے غلام رسول نے وعدہ کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ صوفیہ اپنے برتھ ڈے پر روئے اور پاپا کو یاد کرے ورنہ گھر کا سارا ماحول بدل جائے گا۔ شبنم تو چاہتی تھی کہ کوئی خوشی گھر میں نہ منائی جائے، لیکن صوفیہ کی خوشی کی خاطر خاموش تھی۔
ساجد کئی دن ادھر اُدھر بازار میں بھٹکا کئی دکانوں پر باربی ڈول ڈھونڈی لیکن کسی بھی گڑیا کی قیمت ڈھائی سو روپیہ سے کم نہ تھی۔ اچانک ایک دن اس کی نظر میں ایک اشتہار کی سُرخی پر اٹک گئیں۔
" صرف سو روپیے میں باربی ڈول گھر پر بنائیے جلد رابطہ قائم کیجیے۔ اسٹاک ختم ہونے والا ہے ۔"
ساجد نے فوراً اس کمپنی کو خط لکھ دیا۔ اور اپنے ایک دوست کے پتے پر اس پارسل کو منگوا لیا۔ اس نے جتنا پیسہ اپنے گل لک میں جمع کیا تھا سب پوسٹ مین کے ہاتھ پر رکھ کر پارسل چھڑا لیا۔ دراصل وہ اپنی ممی اور صوفیہ دونوں کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔
پارسل کھولنے کے بعد کچھ کپڑے گڑیا کی شرٹ، پاجامہ، اندر کی مشین اور دو تین چھوٹے بڑے فریم۔ اس کے ساتھ ہدایت کے لیے ایک چھوٹی سی کتاب برآمد ہوئی۔ ساجد نے اُسے میرے گھر لاکے کھولا تھا تاکہ اس کی ماں اور صوفیہ نہ دیکھ سکیں۔ ہدایت پڑھتا گیا اور انھیں جوڑتا گیا کبھی ہاتھ جڑ جاتے تو ٹانگ الگ ہو جاتی اور جب بھی جڑ جاتے تو مشین نٹ ہو جاتی۔ لگا تار وہ کئی دن تک اس جوڑ توڑ میں پریشان رہا۔ لیکن گڑیا نہ بن سکی۔ آخرکار ایک دن میرے سامنے پریشان سا کھڑا ہو گیا اور بولا۔
" انکل پاپا کے نہ رہنے سے کافی پریشانی ہو رہی ہے جب وہ زندہ تھے تو میرا ہوم ورک اور اسکول کا پروجیکٹ بھی کرتے تھے ۔"
" بولو بیٹا اگر میرے لائق کوئی کام ہوا

تو ضرور کر دوں گا۔" میں بولا۔

وہ دوڑا دوڑا گیا اور گڑیا کی ٹانگ، ہاتھ مشین اور لکڑی کا فریم اٹھالایا اور میرے سامنے پٹخ دیا۔ اس کے آنکھ میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ میں نے ہدایت کے صفحے پڑھنے کے بعد ایک ایک کر کے گڑیا کو جوڑ دیا۔ باربی ڈول تیار ہو گئی لیکن اس میں وہ بات نہ آسکی جو کمپنی کی بنائی ہوئی باربی ڈول میں ہوتی ہے۔ کمپنی کی بنائی ہوئی باربی ڈول بولتی ہے، ناچتی ہے اور گاتی بھی ہے یہ تو بس اشتہاری گڑیا تھی، لیکن ساجد بہت خوش تھا کیونکہ اسے یقین ہو گیا تھا کہ جب صوفیہ اچانک دیکھے گی تو بہت خوش ہو گی۔

ہوا وہی جو ساجد نے سوچا تھا۔ صوفیہ کا برتھ ڈے آیا۔ شبنم کے نہ چاہتے ہوئے بھی ساجد غبارے وغیرہ خرید لایا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شام ہوتے ہی وہ روئے اور پاپا پاپا چلائے۔ تقریباً چھ بجتے ہی آس پاس کے چھوٹے چھوٹے سبھی بچّے آ گئے۔ ساجد نے سب کو ادھر ادھر بٹھایا اور صوفیہ کو بلا کر ایک چھوٹا سا کیک کاٹ دیا۔ صوفیہ خوشی سے چہکنے لگی تبھی نہ جانے کہاں سے اچانک صوبیدار اشرف چلے آئے پہلے تو دونوں ہاتھوں سے صوفیہ کو اٹھا کے پیار کرتے رہے اور پھر بڑے سے پیکٹ سے ایک باربی ڈول نکال کر اس کے سامنے رکھ دی یہ وہی مہنگی والی گڑیا تھی جسے ساجد نے بازار میں دیکھا تھا اور پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے خرید نہیں پایا تھا۔ اس کا منہ لٹک گیا، آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے اور چپ چاپ دل پر پتھر رکھ کر خاموش بیٹھ گیا۔ شبنم نے غور سے دیکھا ساجد کے گالوں پر آنسو کے قطرے ٹپکنے لگے تھے وہ تڑپ اٹھی۔

"کیا ہوا ساجد بیٹے! تم کیوں رو رہے ہو؟"

"ممّی میں نے بڑی مشکل سے اپنی گل لک کے سارے پیسوں سے صوفیہ کے لیے ایک باربی ڈول بنائی تھی تاکہ پاپا کے پرامز کو پورا کر سکوں، لیکن اشرف انکل نے باربی ڈول لا کر مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ اب اُسے میں کسی کو نہیں دوں گا بلکہ توڑ دوں گا۔"

اتنا کہتے ہی وہ ماں کے پاس سے اٹھ کر چلا گیا اور اخبار میں لپٹی ہوئی گڑیا کو پاگلوں کی طرح نوچنے لگا۔ ساجد کے آنسو شبنم کے دل میں جلتے تیل کی طرح اترنے لگے۔ وہ اندر ہی اندر تڑپ اٹھی اور اشرف کو باربی ڈول واپس کرتی ہوئی بولی۔

"اشرف! مردوں کے لیے عورت کوئی بازار کی گڑیا نہیں کہ جو اچھی لگے اس سے کھیلنا شروع کر دے۔ عورت اس دنیا کی تخلیق کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اس کی تخلیق اس کے بچّے ہیں۔ وہ اس دنیا میں سب اذیتیں جھیل سکتی ہے لیکن اپنے بچّوں کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی چاہے اس کو دس مردوں کا باربی ڈول بننا پڑے یا اکیلے ہی رانڈ بن کے جینا پڑے۔

اس سے زیادہ اشرف میں سننے کی تاب نہیں تھی وہ ایسے وہاں سے بھاگا جیسے کوئی فوج کا صوبیدار نہ ہو بلکہ چور ہو۔

شمع

زآہد رضوی
شکاگو۔ امریکہ

شمع ہر بزم کی رونق ہے فروزاں ہی رہی
کشتۂ عشق کی صورت میں گریاں ہی رہی
جذبۂ عشق کے احساس سے جلتی ہے سدا
قلب میں اس کے بھڑکتی ہوئی ہے شمعِ وفا
دلِ محبوب کی صورت سے ہے جذبہ دل میں
تیز بڑھتی ہے سدا عشق کی یہ منزل میں
اس کی افتادِ محبّت کو سمجھنا ہے محال
کیسے محسوس کریں قلب کا ہے اس کے جو حال
اس کے لَو دیتے ہوئے شعلے یہ بتلاتے ہیں
عشق کی آگ میں جلنا یہی سکھلاتے ہیں
اُس کے اندازِ وفا میں ہے محبّت کا وقار
نازشِ عالمِ اُلفت ہی رہا اس کا شعار
شامِ غم میں بھی رہی بن کے یہ قندیلِ سحر
دیدہ ور کے لیے روشن تھے کئی زخمِ جگر
اس کے انوار سے ہر قلب میں تابانی ہے
اس کے پَرتَو سے ہر اک سمت درخشانی ہے
گرم یہ ہوتی ہے جس وقت تپش سے اپنی
پھر تو رہتی نہیں پروانوں کی لاشوں کی کمی
شمع کی آگ کو پروانے ہوا دیتے ہیں
اپنی ہستی کو محبّت میں مٹا دیتے ہیں
شمع کے نام سے زآہد ہے محبّت زندہ
لاشِ پروانے سے ہے جذبِ وفا پائندہ

پروانہ

راہِ اُلفت سے جو واقف ہے وہ فرزانہ ہے
شمع پر جاں جو دیتا ہے وہ پروانہ ہے
آگ جو عشق کی سینہ میں نہاں رکھتا ہے
گو ہے خاموش مگر منہ میں زباں رکھتا ہے
دل کی دھڑکن، خلشِ درد جو ہوتی ہے سوا
جانتا ہے اسے ہر طرح یہ آئینِ وفا
اپنے یہ جذبۂ اُلفت کا یقیں رکھتا ہے
شمع کی لَو پہ خوشی سے یہ جبیں رکھتا ہے
عشق اور جنگ میں جیسے ہو ہر اک چیز روا
جان دینا یہ محبّت میں سمجھتا ہے بقا
چوٹ کی طرح سے رکھتا ہے یہ دل میں احساس
جذب رکھتا ہے نگاہوں میں بھی اُلفت کا یہ پاس
سامنا کرتا ہے ہمّت سے یہ ہر طوفاں کا
قلزمِ عشق کا ہوتا ہے شناور تنہا
عشق میں صبر کی قوّت دکھا دیتا ہے
شمع کے جذبۂ اُلفت کو جگا دیتا ہے
اس کی ہمّت پہ ہر اک اہلِ وفا نازاں ہے
قلبِ محبوب پہ ہر ایک نظر پیکاں ہے
اس کے دم سے ہے شعورِ غمِ اُلفت باقی
اس کی فطرت سے ہے احساسِ محبّت باقی
ہے جو پروانہ کا ہر لب پہ فسانہ زآہد
اُس کے جذبہ سے ہے آگاہ زمانہ زآہد

غزلیں

ریاض الدین ریاضؔ

۵۴۷، کھنڈوپاڑہ، بھیونڈی ۴۲۱۳۰۲ تھانے

دامن میں انتظار کے آنسو سمیٹ لے
آئیں گے تیرے کام یہ جگنو سمیٹ لے
رقصاں ہیں دھوپ چھاؤں کی پریاں چہار سو
بکھرے ہیں تجربات کے گھنگھرو سمیٹ لے
پھر میرے انتشار کے بارے میں سوچنا
پہلے تو اپنے شانوں سے گیسو سمیٹ لے
شاخِ غزل پہ لفظوں کے گل ہیں کھلے ہوئے
پیراہنِ خیال میں خوشبو سمیٹ لے
دنیا جھلس رہی ہے تعصب کی آنچ سے
بن جا ریاضؔ سرد ہوا، لو سمیٹ لے

ضیاء جبل پوری

۱۰۴-۲-۱/۱ اولڈ بس اسٹینڈ، کاماریڈی۔ ۵۰۳۱۱۱

چھپا ہوا وہ پرندہ جو سائبان میں تھا
اِک اور تیر ابھی وقت کی کمان میں تھا
دل شکستہ سہی، تیرے سر پہ چھت تو تھی
مقیم تو مرے ٹوٹے ہوئے مکان میں تھا
یہ اور بات کہ کھینچا گیا صلیب پہ وہ
قیام اُس کا مگر چوتھے آسمان میں تھا
تمہاری یاد سے آباد کر لیا میں نے
مرا خرابۂ دل شہرِ بے مکاں میں تھا
اُسی سڑک پہ ہے جو اس نے خود بنائی تھی
ضیاءؔ یہیں پہ کسی قبرِ بے نشان میں تھا

آفتاب اجمیری

پوسٹ بکس نمبر ۱۶۲۶۴ بمبئی ۔ ۱۱

بے برگ و بار دشت کے اشجار دیکھنا
اس دورِ ارتقا کے یہ شہکار دیکھنا
رقصاں قدم قدم پہ یہ سائے چنار کے
ماحول کس قدر ہے پُر اسرار دیکھنا
افلاس و غم کی دھوپ میں سلگے ہیں تن مگر
کندن کی طرح رنگتِ رخسار دیکھنا
یہ کس کی روح قیدِ ستم سے رہا ہوئی
گرتی ہے کس کے جسم کی دیوار دیکھنا
زندہ رہا اگر تو میرے دم سے آفتابؔ
چمکا ہوا نصیبِ شبِ تار دیکھنا

عادلؔ حیات

اے ۔ ۵۹۵، امر پوری، نبی کریم، نئی دہلی ۔ ۵۵

زمیں پر حشر کچھ ایسا بپا ہے
ہر انساں اپنے اندر چھپ گیا ہے
فضاؤں میں ہر اک سو روشنی ہے
نہ جانے آج کس کا گھر جلا ہے؟
نظر آتی نہیں اب شکل کوئی
بس اِک سایا زمیں پر چل رہا ہے
دیے ہیں دوستوں نے زخم اتنے
کوئی ہنستا ہے تو دل کانپتا ہے
جسے کہتے ہیں اُن کی یاد عادلؔ
وہی تو اب مرے دل کی دوا ہے

شاہد انجم

این ۔ ایم ۔ کانونٹ اسکول، بنجاران نور پور ۲۴۶۷۳۴ بجنور

جھیل میں پھول کھلے چھت پہ کبوتر آئے
تو نہ آیا ترے پیغام برابر آئے
مسکراتے ہوئے پھولوں سے دھواں اٹھنے لگا
آج آنکھوں میں جو کشمیر کے منظر آئے
کون طاقوں میں جلاتا ہے سرِ شام چراغ
ہم سا آوارہ پلٹ کر جو کبھی گھر آئے
راز سورج کی بلندی کا سمجھنا ہے اگر
پہلے وہ شخص مرے قد کے برابر آئے
جنگ کا فیصلہ دریا پہ نہ چھوڑو انجمؔ
اب تعاقب میں جو فرعون کا لشکر آئے

باقرؔ بلیاوی

۱۲۴/۶ مشن روڈ، رسڑا، بلیا، یوپی

ابنِ آدم ہی نہ سمجھے تری قیمت مٹی
در حقیقت تو اسی کی ہے حقیقت مٹی
روح کو بخش دیا تو نے لباسِ پیکر
کیا یہی کم ہے کوئی تیری فضیلت مٹی
خاک ہو جائے گا اِک روز یہ خاکی پیکر
روز و شب کرتی ہے انساں کو نصیحت مٹی
بعد مرنے کے بھی آغوش میں رکھا تو نے
کیسے بھولے گی تجھے چشمِ بصیرت مٹی
خدمتِ خلق کا باقرؔ ہے اسے پاس بہت
ورنہ بنتی نہ کبھی وجہ معیشت مٹی

عامیرؔ سعیدی

آزاد نگر ۔ بجرڈیہہ، بنارس

مانا مفلس ہوں مگر تیرا نہیں میں زر خرید
جھک سکے جو تیرے آگے کوئی ایسا سر خرید
اتنی چاہت دارِ فانی کے لیے اچھی نہیں
بیچ کر ایمان دنیا میں نہ کوئی گھر خرید
بے غرض کچھ کام اوروں کے بھی آیا کیجئے
کیوں غریبوں کو بنا رکھا ہے اپنا زر خرید
دولتِ دنیا سے مل سکتی ہے دنیا کی خوشی
کام آ کچھ بے کسوں کے راحتِ محشر خرید
کچھ کیا اپنے لیے عامیرؔ تو کوئی کیا کیا
دے دے خوشیاں غیر کو اپنے لیے نشتر خرید

حفیظ انجم

۵۵۵-۲-۷، کشمیر گڈھ، ضلع کریم نگر، اے پی

بے بسی، بے کسی، بے کلی اور میں
تیرگی، تشنگی، زندگی اور میں
قطرہ قطرہ وہ نفرت کی آلودگی
ریزہ ریزہ محبت مری اور میں
میں بھی تنہا کہاں ہوں میرے ہم نفس
چند سانسیں، تری بے رُخی اور میں
اِک نیا مدّعا اِک نیا مُدّعی!
بے نوا دشت کی منصفی اور میں
اپنے دلبر سے ملنا ہے انجمؔ گلے
ایک ندیا ہے رمتی ہوئی اور میں

اُلفت کا تاج

سطوت زہرا سطوت

سی - ۱۶۹، منٹو روڈ کمپلیکس، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲

محترم جناب نیر صاحب !   السلام علیکم !

"الفت کا تاج" لے کر "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہو رہی ہوں اس امید کے ساتھ کہ اس تاج کو اس کا صحیح مقام حاصل ہوگا۔

خدا کرے آپ کا مزاج بخیر ہو۔

آپ کی بہن
سطوت زہرا سطوت

ہوا کے جھونکے نرم ہوں تو ہری بھری وادیوں میں خرام روی سے گزرتی ہوئی ریل کے سفر کا لطف دوگنا ہو جاتا ہے۔ میں سفر کا پورا پورا لطف اٹھا رہی تھی۔ میری نگاہیں کھڑکی سے باہر کے مناظر کو دیکھنے میں منہمک تھیں کہ اچانک میں چونک اٹھی۔ ہرے بھرے میدان میں جہاں دور دور تک انسانی وجود کا کوئی گزر نہیں تھا، کوئی آبادی نہیں تھی وہاں اس سبزہ زار کے بالکل درمیانی حصے میں وہ صاف اور شفاف قبریں نظر آگئیں، جو بگلے کی طرح چمک رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ان پر تازہ تازہ سفیدی ہوئی تھی یا پھر وہ سنگ مرمر سے بنائی گئی تھیں۔ تجسس نے مجھے آواز دی، شوق نے مجھے لبیک کہا اور میں نے قریبی اسٹیشن پر اتر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے معلوم کرنا تھا کہ اس شہر خموشاں میں کس کا راج تھا۔ اس ویرانے کا بادشاہ کون تھا اور پھر میں نے کئی لوگوں سے ان پرکشش قبروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں آخر ایک بزرگ نے بتایا کہ وہاں بہت پہلے ایک گاؤں تھا۔ اس گاؤں میں تھوڑی سی آبادی تھی۔ بہت ہی خوش حال گاؤں تھا وہ، ایک بڑے گھرانے کا جنھیں گاؤں والے میاں کہتے تھے اور اسی نسبت سے لوگ اسے میاں لوگوں کا گاؤں کہتے تھے۔ گاؤں میں کچھ دوسرے لوگ بھی مفلسی کے سائے میں سانس لیتے تھے محنت مزدوری ان کا روزگار تھا۔ انھیں لوگ 'محلے والے' کے نام سے منسوب کرتے تھے جب بھی میاں لوگوں کے گھروں میں کوئی خوشی یا غم ہوتا یا پھر عید بقرعید جیسے تہوار آتے تو محلے والے کام کاج کے لیے بلا لیے جاتے۔ محنت مزدوری کا صلہ انھیں کھانے یا دو چار روپے کی شکل میں مل جاتا۔ وہ بھی بچپن سے اپنی ماں کے ساتھ میاں لوگوں کے گھروں میں جاتی۔ ماں وہاں مصالحہ پیستی، جھاڑو لگاتی۔ برتن دھوتی اور بی بیوں کے پاؤں دباتی اور وہ دور بیٹھی اپنی موٹی موٹی غلافی آنکھوں سے ان اونچے گھرانے والوں کے رہن سہن اور ان کے طور طریقے اور لباس کو دیکھتی رہتی اور دل ہی دل میں سوچتی رہتی کہ آخر یہ لوگ کون ہیں۔ ؟

'کیا یہ لوگ پری دیس کے رہنے والے ہیں ؟ کیا یہ جنت کے باشندے ہیں ؟'

یوں تو سبھی لوگ کتنے اچھے ہیں۔ مگر یہ عدنان میاں کتنے اچھے ہیں۔ یہ ہمیشہ کتنے اچھے کپڑے پہنتے ہیں۔ وہ تو جیسے پری دیس کے شہزادے ہیں۔ یہ ہمیشہ مجھے اپنے پاس بلاتے ہیں۔ اپنے کھلونے دکھاتے ہیں۔ ان کے کھلونے انسانوں کی طرح بولتے ہیں۔ اگر ان میں چابی بھر دو تو وہ کیسا ٹھمک ٹھمک کر چلتے ہیں۔... وہ ان کے پاس بیٹھ کر ان کے کھلونوں کو دیکھتی رہتی۔ بہت شوق اور تجسس کے ساتھ اور انھیں کھلونوں کو دیکھتے دیکھتے اور جانے کب اور کس طرح وہ دونوں ایک نیا کھیل کھیلنے لگے جسے لوگ محبت کہتے ہیں۔ جسے لوگ پیار کہتے ہیں۔...

اب وہ ایک جوان اور بے حد خوبصورت لڑکی بن چکی تھی۔ وہ زندگی کے سبھی پہلوؤں سے واقف ہو گئی تھی۔ مگر اپنے گھر کی غربت اور گھٹن زدہ ماحول میں بھی شرافت کا دامن تھامے ہوئے تھی۔...

عدنان میاں اس کے دل کی دھڑکن بن چکے تھے۔ عدنان میاں کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ جب بھی وہ انھیں بالکل سفید براق سے کرتے پاجامے میں، سفید چادر اور

سفید تکیے کے غلافوں پر موگرے اور جوہی کے پھولوں کے درمیان بیٹھا ہوا دیکھتی تو وہ اپنے خیال میں اُبال سا محسوس کرتی۔ اب وہ جوانی کی اس دہلیز پر آکھڑی ہوئی تھی جہاں تنہائیاں کاٹنی مشکل ہو جاتی ہیں اور سوچیں بڑھ جاتی ہیں۔ اس کی سوچیں تو اس بڑی حویلی کے در و دیوار پر ارمان بن کر چمک رہی تھیں۔ اس کے دن رات پری دیس کے اس شہزادے کے تصوّر سے جگمگا رہے تھے۔

اب تو وہ دونوں محبّت کی سلطنت کے بادشاہ اور ملکہ بن بیٹھے تھے۔ وہ جان گئے تھے کہ محبت تو ایک آفاقی عطیہ ہے یہ ہر ایک کو کہاں نصیب ہوتا ہے یہ تو ان کی اپنی خوش نصیبی تھی کہ وہ اس آگ میں جل رہے تھے۔ جو لگ جاتی ہے تو بجھائے نہیں بجھتی۔ محبت تو دل کے اندر چور دروازے سے اتنی آہستگی سے داخل ہوتی ہے کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا اور اگر پتہ چلتا بھی ہے تو اس وقت جب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہوتا ہے لیکن سر سے اونچا ہو جانے والے کو اس پانی میں ڈوب جانے میں جو لذّت اور سکون محسوس ہوتا ہے اس کا ہر کسی سے کیا تعلق۔ یہ محبت تو اندر ہی اندر زندگی کا نقشہ بدل دیتی ہے۔ جلتی ہوئی سانسیں گرم آہوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور پیار کرنے والوں کی شخصیت ایسی ہو جاتی ہے کہ جیسے وہ اپنے آپ میں مخفی ہو گئی ہو۔ آخر اپنے آپ میں گم وہ دونوں دنیا و مافیہا سے دور بہت دور نکل آئے۔ ان کی روح کے رشتے اتنے مضبوط ہو گئے کہ وہ سماج اور معاشرے کے پہروں اور ذات پات، اونچ نیچ کی قید سے آزاد ہو گئے، مگر سماج کے محافظوں اور معاشرے کے ناخداؤں کو یہ بات بہت گراں گزری۔

دونوں ہی طرف سختیاں کی گئیں۔ چھوٹی موٹی سزائیں بھی دی گئیں۔ لڑکی کا تعلق غریب بستی سے ہونے کے سبب اس پر کچھ زیادہ ہی مظالم ڈھائے گئے۔ اُسے طرح طرح کے طعنوں سے نوازا گیا۔ "رہے جھونپڑی میں اور خواب دیکھے محلوں کے۔" اپنی اوقات دیکھ اور اُس کا رُتبہ دیکھ ...."...تو زمین اور وہ آسمان تو نے چاند کو چھونے کی کوشش کیوں کی۔" مگر وہ سب کچھ سہہ گئی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ محبت تو ایک آسمانی زبان ہے۔ محبت تو انکساری کا آبشار ہے جو اس آبشار میں ایک بار تر ہو جائے تو اس پر دنیا کی کسی سختی کا اثر نہیں ہوتا۔ روز بروز سماج کی سختیاں ان پر زیادہ سے زیادہ ہوتی گئیں اور جس قدر ان پر سختیاں اور مظالم بڑھتے گئے اسی قدر ان کی بغاوت بھی بڑھتی گئی اور ایک وقت وہ بھی آیا کہ اُسے انارکلی کی طرح دیوار میں چنوا دیے جانے کی سزا تجویز ہوئی۔ ہیر کی طرح اُسے زہر دیے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ سوہنی کی طرح اُسے پانی میں ڈبونے کے منصوبے تیار ہونے لگے۔ تو عدنان میاں نے قیس کی طرح صحرا نوردی نہ کی۔ رانجھا کی طرح خاموش نہ رہے۔ مہیوال کی طرح آنسو نہ بہائے اور فرہاد کی طرح دودھ کی نہریں نہ کھودیں۔ بلکہ انھوں نے ایک انوکھا فیصلہ کیا۔ اس رات وہ دونوں خود ہی دولہا دُلہن بنے۔ انھوں نے بند کمرے میں خود ایک دوسرے کے ساتھ اپنا عقد کیا اور اپنی زندگی کو بھرپور خوشیاں بخش دیں اور صبح ہوتے ہوتے وہ دونوں مسکراتے مسکراتے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے خود اپنی بڑی حویلی کے کنویں میں کود گئے۔ ان کی خواہش کے مطابق ان کی قبریں ساتھ ساتھ ایک ہی جگہ بنوا دی گئیں۔ مگر ان کی موت کے تیسرے ہی دن اس گاؤں میں ایسا سیلاب آیا کہ سارا گاؤں اس میں ڈوب گیا۔ کوئی شخص باقی نہ بچا، لیکن اگر کوئی چیز بچی تو وہ یہی قبریں تھیں۔ اب یہی قبریں اس حقیقت کی شہادت دیتی ہیں کہ یہاں کبھی کوئی گاؤں تھا یا یہاں کبھی آبادی تھی۔"

ان قبروں کی سفیدی کبھی ماند نہیں پڑتی۔ ان پر آج بھی موگرے اور جوہی کے پھول گرتے رہتے ہیں۔ یہ پھول معلوم نہیں ان ناکام دیوانوں کی ناکامی پر اشک بہاتے ہیں۔ یا انھیں اس طرح محوِ خواب دیکھ کر خوشی سے کھلکھلاتے ہیں۔ مسکراتے ہیں۔ ان دیوانوں پر اپنی عقیدتیں نثار کرتے ہیں۔

ان بزرگ کی زبانی یہ واقعات سُن کر میں نے عقیدت بھری نگاہ ان قبروں پر ڈالی، جن کی سفیدی سنگ مرمر کی طرح حسین تھی۔ اس ویرانے میں ان قبروں کی عظمت کسی تاج محل سے کم نہ تھی۔

میں نے عشق کے چہرے پر لرزتے ہوئے ان آنسوؤں کو سلام کرتے ہوئے کہا "بے شک تمہارا تاج محل کسی تاج محل سے کم نہیں۔ بے شک تم اپنے وقت کے ممتاز اور شاہجہاں ہو۔"

●●

میں کیوں اداس ہوں کا بقیہ

کرتے رہے۔

میں اس کی کلکاریاں بھولی نہ اس کے پوپلے مُنہ کی مسکراہٹیں۔ پالنے پر کھڑا ہونے کی کوشش میں اس کا فرش پر گرنا بھی مجھے یاد رہا اور اس کی توتلی زبان کی بازگشت بھی مجھے سنائی دیتی رہی۔

ماشاء اللہ! اُفق کی اُٹھان ایسی تھی کہ اُس کی عمر بتائیں تو کسی کو یقین نہیں آتا۔ اب کوئی قائل ہی نہ ہو تو کیا کیا جائے۔؟ اس کی باتیں بھی تو بھرم پیدا کر دیتیں۔ اسے مطمئن کرنا آسان نہیں تھا کیوں؟ کہاں؟ اور کیسے؟ کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا تھا۔

"آپ کے بیاہ کے وقت میں کہاں تھی؟"

توبہ توبہ! یہ بھی کوئی سوال ہوا؟

جب مسلسل اُس کے کپڑے اسے تنگ ہونے لگے اور اس کی جوتیاں اس کے پیروں میں چھوٹی پڑنے لگیں تو میں چونکی۔ پھر جب اس کا چہکنا بتدریج کم ہو گیا اور ایسا لگا کہ اس کی خاموشی کا وقفہ طویل سے طویل تر ہونے لگا ہے تو مجھے تشویش ہوئی۔

ایسے ہی اپنے گزرے ہوئے دن مجھے بھولے کہاں تھے! مجھے تو وہ تپتی ہوئی دوپہر بھی یاد تھی وہ دن جب کہ آفتاب غالباً سوا نیزے پر آٹکا تھا، اُسے بھی بھلا نہ پائی تھی۔

اب میرے لیے اس فیصلے تک پہنچنے کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں اُفق کا سایہ بن جاؤں۔

●●

ذرا سی بات

شائستہ مجیب

معرفت شعیب شمس، نیشنل سیمپل سروے، ڈیری فارم، پورٹ بلیئر، انڈمان۔ ۷۴۴۱۰۳

نیر بھائی
السلام علیکم!

اکتوبر ۱۹۹۴ء کا شمارہ موصول ہوا۔ افسانہ "نہ جیو گے نہ جینے دو گے" کی اشاعت کا شکریہ۔ میرے ڈیڈی شعیب شمس صاحب نے بھی افسانہ پسند کیا اور عام ڈگر سے ہٹ کر افسانہ لکھنے کی تاکید کی ہے۔ ایک نفسیاتی افسانہ ارسال کر رہی ہوں۔ اگر پسند آجائے تو کسی قریبی شمارے میں شائع کر کے ممنون فرمائیں۔ آپ کی حوصلہ افزائی نے ان دنوں مجھ سے کئی افسانے لکھوائے ہیں۔ انشاءاللہ رفتہ رفتہ سب آپ کو ہی بھیجوں گی۔ بس آپ کی حوصلہ افزائی شرط ہے۔

آپ کی بہن
شائستہ مجیب

آمنہ بیگم اچھی بھلی بیٹھی تھیں۔ جانے یکبارگی انھیں کیا سوجھا کہ وہ برتن صاف کرنے بیٹھ گئیں کیونکہ ان کی یہ تاکید تھی کہ وہ جو کچھ بھی کریں انھیں کرنے دیا جائے اور گھر کا کوئی بھی فرد انھیں ٹوکے نہ کچھ کہے۔ ماشاءاللہ گھر میں جوان بیٹیاں اور بہوئیں بھری تھیں اور وقت پر سب ہی اپنے اپنے کام میں لگی ہی رہتی تھیں کبھی کوئی کام بے وقت نہیں ہوا۔ وقت پر کھانا ناشتہ چائے، آنے جانے والوں کی خاطر و مدارات، سبھی کو وقت پر ٹفن دے کر دفتر، اسکول، کالج بھیجنا۔ کسی کام کی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ دو دو نوکرانیاں بھی تھیں۔ آمنہ بیگم خود بھی تعریفیں کرتیں کہ۔

"اللہ ایسی بہو بیٹیاں سبھی کو دے۔ کبھی ہاتھ ہلانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ کچھ کرنا بھی چاہو تو کرنے نہیں دیتیں یہاں تک کہ خود سے بال تک نہیں دھونے دیتیں۔"

لیکن اس دن جانے کیا ہوا کہ انھیں برتن صاف کرنے کی سوجھ گئی۔ اور جو برتنوں کو قرینے سے شلف پر رکھنے کے لیے اٹھیں تو توازن برقرار نہ رکھ سکیں اور گیلی زمین پر پاؤں پھسلتے ہی دھپ سے گر پڑیں۔ گھر میں شور مچ گیا۔

"امی گر گئیں۔"

"ہڈی ٹوٹ گئی۔"

"ارے کوئی اٹھاؤ، پکڑو، کمرے میں لے چلو۔"

ہنگامے کا شور اور واویلا سن کر سارے مرد بھی دوڑ کر آگئے اور انھیں لاد پھاند کر ہسپتال لے گئے۔ ایکسرے ہونے پر پتہ چلا کہ کولھے کی ہڈی سرک گئی ہے۔

"خدا نے خیر کی کہ فریکچر نہیں ہوا ورنہ بڑی مشکل ہو جاتی۔ اس عمر میں ہڈیوں کا ٹوٹنا تو بس آفت ہی ہے۔" کریم میاں نے اطمینان کی سانس لی۔

"لیکن اب کیا ہوگا؟" رفعت دلہن نے پوچھا جو بہوؤں میں سب سے بڑی تھیں۔

"ڈاکٹر اپنا کام کر رہے ہیں۔ ہڈیاں بٹھائی جا رہی ہیں۔ پلاستر چڑھے گا اور کچھ دنوں تک بستر پر پڑی رہیں گی پھر اللہ نے چاہا تو چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں گی۔" کریم میاں کا لہجہ اکھڑا اکھڑا تھا۔

رفعت دلہن نے سمجھا ماں کی وجہ سے پریشان ہیں۔

"ہڈیوں کو جگہ پر لانے میں تکلیف تو بہت ہوگی؟"

"ارے کوئی پھول کا ہار تھوڑا ہی پرونا ہے جو کچھ نہ ہوگا۔ ہڈیاں ایک دوسرے پر چڑھ گئی ہیں انھیں جگہ پر لانے میں تکلیف تو ہوگی ہی۔" کریم میاں بیوی پر یکبارگی بھڑک اُٹھے۔

"بھابی جان! آپ پریشان نہ ہوں انھیں بے ہوش کر کے ہی سب کچھ کیا جائے گا۔ تکلیف بالکل نہیں ہوگی۔" نسیم میاں جو قریب ہی کھڑے تھے انھوں نے بھابی کو سمجھانے کی کوشش کی اور کریم میاں کو تھوڑی دور لے جا کر کہنے لگے۔

"بھائی جان! آپ بھی ذرا ذرا سی بات پر بھڑک جاتے ہیں۔"

"ارے میاں! یہ بھی کوئی بات ہے۔ ہڈیاں جگہ سے کھسکی ہیں تو انھیں جگہ پر لانے میں تکلیف تو ہوگی ہی۔ بیٹا جوان ہونے کو آیا اور اتنی بھی عقل نہیں۔" کریم میاں کی

تیز آواز رفعت دلہن تک بھی پہنچ رہی تھی۔

"بھابی تو محض ہمدردی میں ایسا پوچھ بیٹھی تھیں۔"

"بھاڑ میں گئی میاں ایسی ہمدردی میں پوچھتا ہوں سب کیا کر رہی تھیں۔ کیا سب کی سب مرگئی تھیں جو اس عمر میں امی کو برتن دھونے کے لیے اٹھنا پڑا۔"

"آپ تو امی کی فطرت کو جانتے ہی ہیں بھائی جان! جب وہ بیٹھے بیٹھے اکتا جاتی ہیں تو کچھ نہ کچھ کرنے لگتی ہیں۔ اسی روز کی بات لیں جب انھوں نے خود ہی جھاڑو لگانا شروع کر دیا جب کہ آدھ گھنٹہ قبل ہی نصیبن بوا جھاڑو لگا کر فارغ ہوئی تھیں، جس نے بھی روکنا چاہا اسی پر برس پڑیں۔"

"غضب خدا کا نصیبن نے یہ جھاڑو لگائی ہے۔ جدھر سے بھی گزرو ایسا لگتا ہے کہ تلوؤں میں کنکریاں چبھ گئی ہیں۔ ارے جھاڑو تو اپنے گھر میں میں لگاتی تھی۔ فرش شیشے کی طرح چمکتا تھا شیشے کی طرح۔ ابا میاں کتنی تعریفیں کیا کرتے تھے۔"

بہر حال جو کچھ ہونا تھا ہو چکا تھا۔ آمنہ بیگم کے کولھے پر پلاسٹر چڑھا دیا گیا اور دو ہفتوں کے لیے کریم میاں نے انھیں نرسنگ ہوم میں داخل کر دیا۔ رفعت دلہن کو رات کے وقت آمنہ بیگم کے پاس نرسنگ ہوم میں رہنے کی ذمے داری سونپی گئی۔ وہ آمنہ بیگم کو صبح کا ناشتہ کرا کر گھر جاتیں اور رات کے وقت سبھی کو کھانا کھلا کر پھر نرسنگ ہوم آجاتیں۔ دن کے وقت ان کی دیکھ بھال کوئی اور کر لیتا تھا۔

لیکن حادثے کے دن کے بعد سے رفعت دلہن نے آمنہ بیگم کے متعلق کبھی منہ نہیں کھولا حالانکہ وہ جاننا چاہتی تھیں کہ پلاسٹر کب کٹے گا اور آمنہ بیگم گھر کب واپس جا سکیں گی۔ لیکن کریم میاں کے اس دن کے رویے نے رفعت دلہن کو بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا۔ بہت دکھ ہوا تھا انھیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ اگر انھوں نے امی بیگم کی تکلیف کے متعلق دریافت کر بھی لیا تھا تو ایسی کون سی آفت آگئی تھی جو انھوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ یہ بھی نہیں دیکھا کہ خاندان کے سب چھوٹے بڑے وہیں موجود تھے۔

اور آمنہ بیگم کے پاس بیٹھے بیٹھے جب بھی انھیں یہ بات یاد آجاتی تو ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے۔

آخر ایک دن آمنہ بیگم نے انھیں آنسو پونچھتے ہوئے دیکھ ہی لیا۔

"کیا بات ہے رفعت دلہن؟"

"کچھ نہیں امی! بس آپ کی تکلیفیں برداشت نہیں ہوتیں۔"

"اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں بیٹا! ڈاکٹر نے اپنا کام کر دیا۔ سارے لوگ تیمارداری کر ہی رہے ہیں۔ اب کچھ ہی دنوں کی بات ہے۔ اللہ نے چاہا تو اچھی ہو کر جلد ہی گھر چلوں گی۔"

"انشاء اللہ۔"

"اور پھر تمھاری خدمت۔ اللہ تمھیں اس کا اجر ضرور دے گا بیٹی!"

اسی وقت کریم میاں آگئے۔

"بیٹا! تو خوش نصیب ہے جو تجھے اتنی لائق بیوی ملی ہے۔ گھر کی فکر کرنا سبھی کی خوشیوں کا خیال رکھنا اور میری تیمارداری تو اس نے ایسی کی ہے جو بیٹیاں بھی نہیں کر سکتیں۔ ساری ساری رات اس نے آنکھوں میں کاٹی ہے۔"

"ہاں امی! میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ ان کی خدمت اور تیمارداری سے سبھی متاثر ہیں۔ نسیم میاں نے تو پروگرام بنا رکھا ہے کہ آپ کے غسل صحت کے دن وہ اپنی بھابی کو پھر سے دلہن بنائیں گے۔ مجھ سے زبردستی انھوں نے بنارسی ساری بھی منگوالی ہے۔"

"ارے ہٹ! نسیم تو شروع ہی سے باؤلا ہے۔ نہ جانے کیا کیا حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ بھلا اب اس عمر میں جب بیٹا جوان ہونے کو آیا بھابی کو پھر سے دلہن بنائے گا۔ پگلا کہیں کا۔"

"نسیم میاں کی خواہش ہے تو انھیں کرنے دو امی! بچوں کا دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے، جس میں تم لوگوں کی خوشی ہے وہی کرو۔"

رفعت دلہن جو اتنی دیر سے بیٹھی سب کچھ سن رہی تھیں، یکبارگی پھٹ پڑیں۔

"بچوں کے دل ٹوٹنے کا بہت احساس ہے لیکن ان کا نہیں جن سے زندگی بھر کا ساتھ ہے۔ مجھے پسند نہیں یہ سب چونچلے۔ میں ان ڈھکوسلوں میں نہیں پڑتی۔ واہ! یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ بھری محفل میں سبھی کے سامنے ذلیل کریں، ڈانٹیں، پھٹکاریں اور پھر یہ سب چونچلے کریں۔ میں کہے دیتی ہوں کہ اگر یہ سب کچھ ہوا تو بھری محفل میں میں بھی نئی بنارسی ساری کی دھجیاں بکھیر دوں گی۔"

کریم میاں سر جھکائے ہوئے فوراً ہی کمرے سے نکل گئے۔

اور آمنہ بیگم کچھ نہ جانتے ہوئے بھی سب کچھ جان گئیں۔

●●

خوف

ساغر صدیقی
بی ۱۱ پوسٹل کوارٹرز، سول لائنز - آکولہ - مہاراشٹر ۴۴۴۰۰۱

محترم مدیر
السّلام علیکم
بیسویں صدی کے لیے اپنی تازہ تخلیق "خوف" ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ افسانہ آپ کو پسند آئے گا۔ شریکِ اشاعت کر کے ممنون فرمائیے۔ خدا سے دعا کرتا ہوں کہ "بیسویں صدی" ہر ماہ پابندی سے شائع ہوتا رہے۔ (آمین)

خاکسار
ساغر صدیقی

پروفیسر منوہر اناٹمی کی پریکٹکل کلاس لے رہے تھے۔ ہال میں ایک لمبی سی ٹیبل پر ایک مرد کی لاش پڑی تھی، جس کی کھوپڑی کھلی ہوئی تھی اور دماغ کے تمام حصے واضح تھے۔ میڈیکل کالج کے فرسٹ ایر کے طلبا و طالبات ٹیبل کو گھیرے کھڑے تھے اور بڑی دلچسپی سے اس لاش کے دماغ کا معائنہ کر رہے تھے۔ پروفیسر منوہر کی بھاری آواز ہال میں گونج رہی تھی۔

"یہ دماغ کا سب سے چھوٹا حصہ ہے جسے شعور کہتے ہیں یہ ہماری سوچ کی پیدائش کا مرکز ہے اور ہماری نفسیات کا گھر۔ باقی حصے جسم کے اندرونی عمل کو لگاتار حکم دیتے رہتے ہیں۔ دماغ کے احکامات ان نروز کے ذریعے ہمارے ہاتھ پاؤں، آنکھ و دیگر تمام اعضا تک پہنچتے رہتے ہیں اور ہمارے اعضار غیر محسوس طور پر دماغ کے احکامات کے تحت حرکت کرتے رہتے ہیں۔" عرشی نے غور سے دماغ کے اس چھوٹے سے حصے کو دیکھا اور حیرت میں ڈوب گئی اتنا چھوٹا سا گوشت کا ایک لوتھڑا اور انسانی زندگی کی تمام اتھل پتھل کا ذمے دار۔ وہ اپنی سوچ میں ڈوب گئی۔ اب اُسے پروفیسر کے الفاظ سنائی نہیں دے رہے تھے۔

"مس عرشی اپنی کنفیوژن؟" پروفیسر کی آواز سن کر وہ چونک پڑی۔

"یس سر، نو سر۔" اس نے بوکھلا کر کہا اور سبھی طلبا ہنس پڑے۔

گھر آکر عرشی بڑی دیر تک اپنے خیالات میں گم رہی اسے بار بار پروفیسر منوہر کے الفاظ یاد آرہے تھے۔ "اگر دماغ کا یہ حصہ کام رہا بند کر دے تو انسان ہر سوچ و فکر سے آزاد ہو جاتا ہے۔ تمام احساسات یکسر فنا ہو جاتے ہیں اور پھر وہ پاگل کہلاتا ہے۔" اتنا بڑا انسانی جسم اتنے چھوٹے سے عضو کا غلام ہوتا ہے؟ اس نے خود سے کہا اور لباس تبدیل کرنے باتھ روم میں چلی گئی۔

عرشی ایک متوسط گھرانے کی آزاد خیال لڑکی تھی۔ اس کے والد ریلوے کے محکمے میں آفس سپرنٹنڈنٹ تھے۔ عرشی نے امتیازی نمبروں سے انٹر پاس کیا تھا اس لیے اُسے گورنمنٹ میڈیکل کالج میں آسانی کے ساتھ داخلہ مل گیا تھا۔ چونکہ گھر کے سبھی بچوں میں سب سے بڑی تھی اس لیے باپ کی لاڈلی بیٹی تھی۔ دونوں بھائی چھوٹے تھے۔ اکثر ذرا ذرا سی بات پر عرشی سے لڑ پڑتے تھے۔

عرشی رات بھر بے حد مضطرب رہی نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی وہ بار بار کروٹیں بدلتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ غم اور خوشی کے انسانی رویّے کا ردِّ عمل دماغ کے ایک ننھے سے گوشے سے جنم لیتا ہے اور انسان کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے یکلخت اس کے ذہن میں ایک سوال گونجا "اگر میرے دماغ کا یہ حصہ کام کرنا بند کر دے تو کیا میں پاگل ہو جاؤں گی؟" وہ بے چین ہو کر اٹھ بیٹھی۔ پیاس سے اس کا گلا سوکھ رہا تھا۔ اس نے اُٹھ کر فریج سے پانی کی بوتل نکال کر منہ سے لگالی۔ جب وہ اپنے بستر کی طرف لوٹ رہی تھی تو اس نے اپنی ماں کو اپنی طرف متوجہ پایا۔

"کیا بات ہے عرشی! کوئی پرابلم ہے؟ کیا۔۔۔؟"

"ممّی او سویٹ ممّی۔" عرشی نے آگے بڑھ کر ماں کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ "ممّی میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں سائیکولوجسٹ بنوں گی۔" اس نے اپنی ماں کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

اور پھر وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل ہو گئی تھی۔ میڈیکل گریجویشن کے بعد اس نے پوسٹ گریجویشن کے لیے اپلائی کیا۔ ایم۔ ڈی کرنے کے بعد امریکن سوسائٹی فار سائیکولوجی میں دو سالہ فیلوشپ کے لیے

درخواست روانہ کردی۔ حکومت کے تعاون اور اپنی صلاحیتوں کی بنا پر اسے فیلو شپ بھی مل گئی۔ اور پھر ماں باپ کی مرضی کے خلاف اس نے امریکہ میں اپنی فیلو شپ مکمل کی۔ اس تمام عرصے میں گوشت کا وہ لوتھڑا جسے دماغی شعور کہتے ہیں اس کے ذہن سے برابر چپکا رہا تھا۔

امریکہ سے واپسی کے بعد عرشی نے ایک مشہور ماہر نفسیات کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ اس کی پریکٹس شروع ہی سے بہت حوصلہ افزا رہی وہ اپنے فیصلے پر مطمئن تھی۔ ایک روز اس کی کلینک میں ایک عجیب کیس آیا۔ جاوید نامی اس اسمارٹ اور باسلیقہ نوجوان سے عرشی بے حد متاثر ہوئی تھی۔ عرشی نے اُسے سامنے کرسی پر بٹھایا اور مسکرا کر پوچھا۔

"کہئے آپ کا پرابلم کیا ہے ؟"

"ڈر۔ ڈاکٹر خوف ہی میرا سب سے بڑا پرابلم ہے۔ میں ایک مشہور کمپنی میں اونچے عہدے پر فائز ہوں۔ میرا کیریر شاندار ہے اور ویسے مستقبل بھی تابناک ہی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن میں مستقبل سے بہت ڈرتا ہوں مجھے ہر آن کچھ کھو جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے آخر انسان ہر بات سے ڈرتا کیوں ہے ڈاکٹر؟" جاوید نے اپنی تفصیل ادھوری چھوڑ کر اچانک عرشی سے سوال کرلیا۔

"اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔" عرشی نے مسکرا کر میٹھی آواز میں کہا۔ "کچھ لوگ بچپن ہی سے دوسروں کے سہارے زندگی گزارنے کے عادی ہو جاتے ہیں ایسے لوگوں سے اگر زندگی کے کسی اسٹیج پر اچانک سہارے چھین لیے جائیں تو پھر وہ اپنی خود اعتمادی کھو بیٹھتے ہیں اور ہر چیز سے ڈرتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جنھوں نے بغیر کسی سہارے کے بڑی جدوجہد اور مشکل سے اپنا کیریر بنایا ہو اور اپنے مقصد کو بڑے جتن سے حاصل کیا ہو۔ جب ایسے لوگ اپنا مقام پا لیتے ہیں تو ان کے دماغ میں اٹھنے والی خوشی کی لہروں کو عدم تحفظ کا احساس دبا دیتا ہے۔ پھر یہ احساس انسانی سوچ اور اعتماد کی بنیادوں کو کھوکھلا کر کے سارے ذہن پر چھا جاتا ہے اور انسان ڈرنے لگتا ہے۔ اپنے ہر فعل کے نتیجے سے، مستقبل سے، اپنی خواہشات کی تکمیل سے یا جو کچھ وہ حاصل کرتا ہے اسے اس کے کھو جانے کا ڈر رہتا ہے — دراصل یہ خوف ہمارے ذہن کے ردِ عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔" عرشی خاموش ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

"ونڈر فل۔ ڈاکٹر آپ نے واقعی چند منٹوں میں میرے ذہن کی بند گرہوں کو کھول دیا۔" جاوید نے مسرور ہو کر کہا۔

"ویسے آپ شام کا وقت کہاں گزارتے ہیں"؟ عرشی نے دلچسپی لیتے ہوئے آہستہ سے دریافت کیا۔

"ڈاکٹر دراصل میرا سارا وقت کمپنی کی مصروفیات میں صرف ہو جاتا ہے۔ نہ کوئی تفریح باقی رہی نہ کوئی دوست۔" جاوید نے افسردگی سے کہا۔

"یہی غلطی آپ کی پریشانی کا باعث ہے زندگی کی خوشیوں کا دارومدار بڑی حد تک انسان کے عمل سے متعلق ہوتا ہے۔ آپ کے لیے ضروری ہے کہ کچھ وقت آپ دفتر یا کمپنی

کی مصروفیات سے نکال کر ایک نئے ماحول اور نئے دوستوں میں گزاریں۔ بس آپ کے لیے یہی کافی ہے کوئی میڈیسن ضروری نہیں ہے۔" عرشی نے پیشہ وارانہ لہجے میں کہا۔

"ویسے ڈاکٹر اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی شام کا کچھ وقت آپ کے ساتھ گزارنا پسند کروں گا۔ بہ حیثیت مریض ہی سہی۔" جاوید نے شرارت سے کہا۔

"جی۔ میں۔" عرشی بوکھلا کر رہ گئی۔

"بائی دی وے آپ کے کلینک کے اوقات کو میں نے ذہن نشین کر لیا ہے۔ کل کلینک کے بعد میں آپ کو گھر پر ڈراپ کروں گا۔" جاوید نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں مسکرا کر کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ عرشی بڑی دیر تک اپنی کرسی پر گم صم بیٹھی رہی۔ جاوید کی شخصیت اس کے اطوار اور دلیری نے اس پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ کچھ دیر کی ملاقات جیسے برسوں کی شناسائی بن گئی ہو۔ اسے اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی اسے محسوس ہوا جیسے وہ جاوید میں یکلخت دلچسپی لینے لگی ہو۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ وہ کسی مرد سے اس حد تک متاثر ہوئی تھی پتہ نہیں جاوید نے اس کے دبے ہوئے جذبات کے کون سے گوشے کو چھو دیا تھا۔

پھر دونوں کی شامیں اکثر ساتھ ہی گزرتیں۔ جاوید ہر ملاقات میں بڑی شائستگی سے پیش آتا وہ ہمیشہ یہی کوشش کرتا کہ اس کے آداب عرشی پر اچھا اثر مرتب کریں۔ وہ جب بھی ملتے اپنی پیشہ وارانہ شناخت کو یکسر فراموش کر بیٹھتے اور عام دوستوں کی طرح ایک دوسرے کے مسائل پر بحث کرتے۔ ایک دن کلینک میں جب عرشی اور جاوید تنہا بیٹھے زمانے بھر کی باتیں کر رہے تھے تبھی جاوید نے اچانک بے تکلفی سے عرشی کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

"عرشی سچ کہو کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں بے پناہ شدید محبت؟" وہ عرشی کی آنکھوں میں شرارت سے جھانک رہا تھا۔

"تمہارا بے باک انداز اور سوال مجھے دونوں ہی پسند آئے۔" عرشی نے میٹھی سی مسکراہٹ لبوں پر بکھیرتے ہوئے کہا۔ اُسے بے حد خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ جاوید تھینکس کہہ کر جا چکا تھا، لیکن عرشی اس کی محبت کے دائروں میں مقید ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک عجیب سا نشہ تھا۔ ایک نئی خوشی ایک مسرور کن بے خودی اس کے سارے وجود پر چھا گئی تھی۔ اسی رات اس کی خوشی کو اس کی ماں نے بھی بھانپ لیا اور محبت کے ساتھ عرشی سے پوچھا۔

"کیا ہماری ڈاکٹر نے کوئی نیا ساتھی پا لیا ہے۔"؟

"اوہ ممی آئی لو یو۔" کہہ کر عرشی ماں سے لپٹ پڑی تھی۔

وہ رات بڑی دیر تک بستر پر سوچتی رہی آخر جاوید کو اس کی شخصیت کی کس خوبی نے متاثر کیا ہوگا۔ کیا اس کی باوقار پرسنلٹی نے یا اس کے حسن نے۔ لیکن جاوید ایک بڑی کمپنی کا ذمے دار ہونہار ایگزیکٹو تھا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باشعور انسان کوئی سڑک چھاپ رومیو تو نہیں جو ہر حسین لڑکی کو دیکھ کر دل دے بیٹھتے ہیں۔ پھر اس کی چاہت کا سبب کیا تھا۔؟ پھر ایک نیا خیال اس کے ذہن کے گوشے میں ابھرا۔ جاوید ضرور اس کی ذہانت سے قائل ہوا ہوگا۔ کیونکہ شائستگی، سلیقہ مندی اور ذہانت حسن میں چار چاند لگا دیتے ہیں اور حسین کو اور بھی حسین بنا دیتے ہیں اس خیال سے وہ خود ہی شرما گئی۔ وہ اپنی ذہانت پر فخر کرتے کرتے نیند کی آغوش میں چلی گئی لیکن نیند میں ایک ہلکا سا اضطراب اس کے اعصاب پر حاوی رہا۔ اچانک وہ جاگ پڑی اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا تھا اور وہی خیال ذہن کے پردے پر تھرکنے لگا۔ گوشت کا ایک ننھا سا لوتھڑا اگر اپنی حرکت بند کر دے تو سارے احساسات، سارے جذبات، اور ساری ذہانت ایک پل میں فنا ہو جائے گی۔ وہ ایک ماہر نفسیات تھی لیکن اپنے اس خیال سے خود ہی پریشان ہو اٹھی کہ اگر یہ سانحہ اس کے ساتھ بھی پیش آگیا تو۔ کیا وہ پاگل کہلائے گی۔ پاگل؟ ایک وحشت سی اس کے حواس پر چھا گئی۔ اُسے بڑی شدت سے پیاس محسوس ہوئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پانی کا جگ اُٹھانا چاہا لیکن وہ پھسل کر فرش پر گر پڑا ایک جھنکار کمرے میں گونج اٹھی اور عرشی خوف سے لرز اٹھی۔ کیا اس کے اعصاب کمزور ہو رہے ہیں؟ اس نے ساری رات بے چینی اور اضطراب میں گزار دی۔ صبح وہ کلینک بھی نہ گئی۔ جاوید نے حسبِ معمول اسے وش کرنے کے لیے کلینک پر فون کیا اور پھر اُسے وہاں نہ پا کر گھر پر رابطہ قائم کیا۔

"جاوید تم گھر چلے آؤ۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" کہہ کر عرشی نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر کے پلنگ پر ٹیک لگائے بیٹھی رہی اور اس نے اس وقت چونک کر آنکھیں کھولیں جب جاوید اس کا شانہ پکڑے اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔

"عرشی! کیا ہوا ہے تمہیں؟" وہ پریشان نظروں سے عرشی کو گھور رہا تھا۔

"جاوید! مجھے... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ جیسے میں پاگل ہو جاؤں گی۔ ایک عجیب سا خوف دماغ میں سمایا ہوا ہے۔ کیا میں... میں تمہیں کھو دوں گی۔ کیا میرے جذبات، احساسات سب یکلخت فنا ہو جائیں گے۔ یہ کیسا ڈر ہے جاوید؟" عرشی نے جاوید کے دونوں ہاتھ تھام کر لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"مائی ڈیر سائیکلوجسٹ تمہارے اس ڈر کا علاج کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں ہے۔ یہ لڑکیوں کی فطرت ہے اور اس کا علاج مرد کی محبت بھری مضبوط بانہوں کے حصار میں ہوتا ہے۔" کہہ کر جاوید نے عرشی کو پلنگ سے اٹھا لیا۔ عرشی نے شرما کر جاوید کے سینے سے اپنا سر ٹکا دیا۔ اب اُسے اپنے اندر سمندر سا گہرا سکون محسوس ہو رہا تھا۔ وہ متعجب تھی سینکڑوں لوگوں کے ذہنوں کو پڑھنے والی ڈاکٹر کیا خود اپنا ذہن پڑھ نہ سکی۔ اس نے سوال کیا۔

"جاوید۔ کتابوں میں جو لکھا ہوتا ہے کیا حقیقی زندگی سے اس کا تعلق نہیں ہوتا؟ کیا وہ صرف کتابی باتیں ہوتی ہیں؟"

"کتابیں انسانوں ہی نے لکھی ہیں اور انسان اپنی فطرت کا خالق نہیں ہوتا۔ اس کی فطرت تو بس اس کا خالق ہی سمجھ سکتا ہے۔" جاوید کا جواب سن کر عرشی مسرت سے جھوم اٹھی اور جاوید کی بانہوں میں جھول گئی۔

چند اسلامی بہترین کتب

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
ہشت بہشت	۱۱۰	بارہ تقریریں	۲۲	دین مصطفیٰ	۵۵
جامع کرامات اولیاء	۱۱۰	نقش کربلا	۱۳	سلطنتِ مصطفیٰ	۸
بہجۃ الاسرار شریف	۸۰	غوث الوریٰ	۱۵	احکامِ شریعت	۳۵
سنی بہشتی زیور	۵۰	نماز کی تعلیم	۱	خطبات اعظمی (اوّل)	۱۶
شمع شبستان رضا	۵۰	رسول کریم	۸	〃 (دوم)	۱۴
شام کربلا	۴۰	جوانی کی حفاظت	۷	خطبات ربانی (اوّل)	۱۶
عقائد اسلام	۴۰	دل کی مراد	۴	〃 (دوم)	۱۴
بیس تقریریں	۴۵	محمد رسول اللہ قرآن میں	۴	خطبات ہاشمی	۱۵
نمازیں اور دعائیں	۳۵	فتوح الغیب	۱۰	سچی نماز	۱۰
اسلام میں پردہ	۳۰	معراج النبی	۱۳	اسلامی زندگی	۱۰
لالہ زار	۳۰	سرکار کا جسم بے سایہ	۳	میلاد النبی	۶
دلائل الخیرات شریف	۳۵	عورتوں کی نماز	۶	ماہِ شعبان اور شب برات	۶
فوائد الفوائد	۳۵	محمد عربی میدانِ جنگ میں	۲۵	مسائلِ رمضان	۸
فضائل درود	۲۵	شانِ حبیب الرحمٰن	۳۰	شانِ خطابت	۱۵

بیسویں صدی پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ بی-۱، نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳
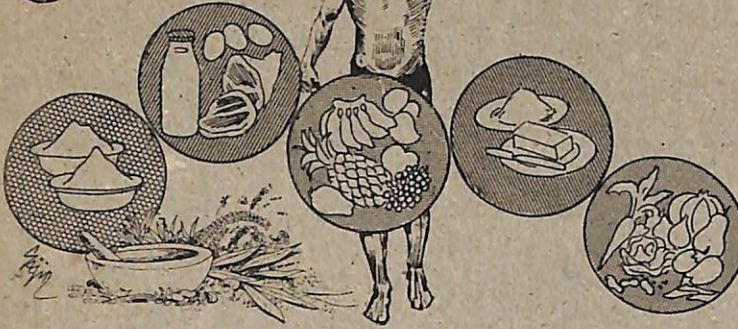
انسان کی صحت

غذا کے بارے میں انسان کی غلطیاں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس لیے بیماریوں کی تعداد اور ان کی طاقت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایسی چیزیں جنھیں قدرت نے ہمارے کھانے کے لیے نہیں بنایا ہے ہماری غذا میں داخل ہوگئی ہیں۔ صحت قائم رکھنے کے لیے بہت سے اصول ہیں، لیکن ان سب میں بڑا اصول ہے صحیح غذا۔ جو لوگ اس اصول کی پابندی کرتے ہیں، ان کے لیے صحت مند رہنا آسان ہے اور جو لوگ اس اصول کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان کی قسمت میں صحت سے محرومی اور ناگہانی موت لکھ دی جاتی ہے۔

توری: ایک مفید سبزی

توری دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک گھیا توری جس کی بیرونی سطح چکنی اور ہموار ہوتی ہے اور دوسری کالی توری جس پر لمبائی کے رخ ابھری ہوئی کھردری لکیریں ہوتی ہیں ـــــ توری کی دونوں قسمیں سرد و تر ہیں اور زود ہضم بھی۔ گرم مزاج والوں کے لیے اور گرم امراض میں اس کا استعمال بے حد مفید ہے۔ بخار کے مریضوں کے لیے گھیا کدو کی طرح توری کی ترکاری بھی بہت مفید ہے۔ اس لیے کہ یہ پیشاب لاتی ہے اور حرارت کو تسکین دیتی ہے۔

گھیا توری کسی قدر بادی ہوتی ہے اور نفخ پیدا کرتی ہے۔ اس لیے اسے پکاتے وقت اس میں زیرہ ضرور ڈالنا چاہیے جس سے اس کا بادی پن کم ہو جاتا ہے۔

تربوز

سرد و تر ہے۔ کافی غذائیت رکھتا ہے اگر گرم چیزیں کھانے یا صفرا زیادہ پیدا ہونے سے بدن میں گرمی بڑھ جائے، بدن لاغر ہو جائے تو کچھ دنوں تک متواتر تربوز کھانے سے گرمی اور صفرا کا غلبہ دور ہو جاتا ہے۔ اور بدن کی کمزوری رفع ہو جاتی ہے۔ بدن کو غذائیت دینے کے ساتھ ہی تربوز قبض کشا بھی ہے۔ صفراوی بخار میں تربوز کا پانی پلانے سے پیاس کی شدت اور بخار کی حرارت کم ہو جاتی ہے۔ سل و دق اور خشک کھانسی میں بھی فائدہ بخشتا ہے۔ پیشاب کی جلن، یرقان اور سنگ گردہ و مثانہ میں اس کے استعمال سے فائدہ ہوتا ہے۔

نہار منہ تربوز نہیں کھانا چاہیے۔

کھانا کھانے کے فوراً بعد بھی تربوز کھانا مضر ہے اور اس سے نظام ہضم خراب ہو جاتا ہے۔ تربوز کھانے کا بہتر وقت سہ پہر ہے۔ تربوز پر تھوڑا سا نمک چھڑک کر کھانا بہت مفید ہے۔

ہم بوڑھے کیوں ہو جاتے ہیں

کسی نے ایک فرانسیسی مصنف سے سوال کیا ہم بوڑھے کیوں ہو جاتے ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ اس کے تین سبب ہیں۔ اوّل یہ کہ ہم ہوادار اور فراخ جگہ میں ورزش نہیں کرتے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ نہایت چھوٹے چھوٹے کیڑے جنھیں سائنس کی اصطلاح میں جراثیم کہا جاتا ہے ہمارے اندر ہی اندر زہر پھیلاتے رہتے ہیں اور ہماری طبیعت اپنی کمزوری کے باعث انھیں ہلاک نہیں کر سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ غالب آ کر ہماری ہلاکت کا باعث بن جاتے ہیں۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ موت کا خوف جو ہماری ہمت کو پست اور ہمارے ارادوں کو متزلزل رکھتا ہے۔

مسرت کی قیمت

دنیا کی دوسری چیزوں کی طرح مسرت بھی ایک جنس ہے جسے کچھ دے کر ہی ہم پا سکتے ہیں۔ کیا دنیا کی کوئی چیز قیمت ادا کیے بغیر مل سکتی ہے؟ اگر نہیں تو ہم خوشی کی قیمت ادا کرنا کیوں نہیں چاہتے؟ یا اس کی قیمت سے کیوں ناواقف ہیں۔ آپ اس شخص کو کیا کہیں گے جو کوئی بیش قیمت چیز قیمت ادا کیے بغیر یا مفت حاصل کرنا چاہتا ہو۔ کیا آپ اسے انتہائی احمق، پرلے درجے کا خود غرض نہ کہیں گے۔ اسی طرح جو لوگ کچھ دیے بغیر خوشی کا لطف حاصل کرنے کا خواب دیکھتے ہیں۔ انھیں کسی طرح حق بجانب نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ہماری اور آپ کی نظر میں ایسے بے شمار لوگ ہیں جو خوشی سے محروم ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ وہ خوشی کی اصل قیمت ادا کرنا نہیں چاہتے۔ اگر مال و دولت سے خوشی کو خریدا جا سکتا تو آج ان لوگوں سے زیادہ خوش کوئی نہیں ہوتا جن کے پاس دولت کی فراوانی ہے لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ایسے بے شمار لوگ بھی حقیقی مسرت سے ہمکنار نہیں ہوتے جنھیں ہر طرح کے مادی ذرائع اور وسائل میسر ہیں۔ اور جن کے پاس دولت کی کمی نہیں۔ کاش ایسے لوگ انسانی تعلقات کی سائنس کے اس بنیادی نکتے کو سمجھ سکیں

دوسروں کو خوشی دینے سے ہی حقیقی خوشی حاصل ہوتی ہے۔

ایک نسخۂ کیمیا

ایک مشہور مفکر نے لکھا ہے کہ اگر تم اپنی زندگی کے دامن کو مسرت و شادمانی، کامیابی و کامرانی کے پھولوں سے بھر لینا چاہتے ہو تو اس نسخۂ کیمیا پر عمل کرو۔
"آج کا دن میرا دن ہے۔ آج میں کوئی برا خیال، نفرت، غصہ، خوف یا حسد نہیں کروں گا۔ میں اپنی ذات کو ان چیزوں سے بچاؤں گا اس پُر مسرت دنیا میں صحت، سلامتی مسرت اور خوشی میرے ہاتھ میں ہے۔"
بظاہر یہ بہت معمولی، بہت آسان سی بات ہے لیکن اگر اس پر عمل کیا جائے اور اسے زندگی کا معمول بنا لیا جائے تو اپنی اہمیت کے اعتبار سے یہ ایک نسخۂ کیمیا سے کم نہیں!

زندگی کا المیہ

جے. ڈیوٹ فاکس. ایچ. ڈی نے لکھا ہے جوانی اور صحت پانی کی طرح ہے۔ انھیں عام تصور کیا جاتا ہے۔ ہم پیاس کی شدت کو اس وقت تک محسوس نہیں کرتے جب تک کنواں خشک نہیں ہو جاتا۔ ہم اسی طرح صحت اور جوانی کی قدر نہیں کرتے جب تک کھو نہیں جاتی۔ لیکن زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم صحت و شباب کو خود کھو کر اپنے قاتل آپ بنتے ہیں اپنی قدرتی تعمیری صلاحیتوں کو خود ہی موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔

زندگی کے مسرت آگیں لمحات

لارڈ میکالے نے لکھا ہے کہ میری زندگی کے سب سے مسرت آگیں لمحات وہ تھے جو میں نے کتب بینی میں گزارے۔ اگر مجھے ساری دنیا کا بادشاہ بنا دیا جائے اور میرے رہنے کے لیے خوبصورت محلات اور آسائش کے تمام سامان ہوں لیکن یہ قید لگا دی جائے کہ میں مطالعہ نہ کروں تو میں اس شرط پر بادشاہ بننے سے انکار کر دوں گا۔

دوسروں میں دلچسپی لیجیے

اگر آپ بااثر بننا چاہتے ہیں تو دوسروں میں دلچسپی لیجیے۔ دوسروں کی کامیابی اور خوشی کو اپنی کامیابی سمجھیے۔ اگر آپ نے کسی کی پریشانیوں میں ہاتھ بٹایا تو سمجھ لیجیے کہ وہ آپ کا بندۂ بے دام ہو جائے گا تاہم آپ اسے بندۂ بے دام بنانے کی کوشش نہ کیجیے اسے اپنا دوست بنائیے کسی ایک سے نہیں بلکہ سب کے ساتھ یہی رویہ رکھیے سب کے دکھ سکھ میں حصہ لیجیے پھر دیکھیے آپ کی شخصیت کتنی پُرکشش بن جاتی ہے۔ زندگی کی طویل اور دشوار گذار راہ میں وہی شخص دوسروں کو اپنا ساتھی بنا سکتا ہے جو خود پہلے دوسروں کا بن چکا ہو۔

کامیابی کا راز

انگلستان کے نہایت کامیاب اخبار نویس سر ہارس واتھ نے جو تمیں درجن اخباروں اور رسالوں کے مالک ہیں، اپنے ایک مقالے میں لکھا ہے کہ کسی شخص کی کامیابی کے لیے سب سے ضروری یہ ہے کہ وہ اپنی ساری قوت و صلاحیت اور سرمائے کو صرف ایک کام پر خرچ کرے تاکہ اس کی کامیابی یقینی ہو جائے۔ جو لوگ اپنی صلاحیت اور سرمائے کو ایک وقت میں کئی کاموں میں لگاتے ہیں، چاہے ان میں کتنی ہی غیر معمولی لیاقت اور صلاحیت ہی کیوں نہ ہو، وہ بہت کم کامیاب ہوتے ہیں۔ امریکہ کے ایک مفکر نے لکھا ہے کہ جس طرح لوہار کی بھٹی میں ایک وقت میں ایک لوہا اچھی طرح گرم ہو سکتا ہے، اسی طرح ایک وقت میں ایک ہی کام میں کامیابی مل سکتی ہے۔ جو شخص ایک ہی بات کو ہر وقت سوچتا رہتا ہے وہ اس میں کئی نکتے پیدا کر لیتا ہے۔ یہی کامیابی کا راز ہے۔

مکھن

مکھن جیسی مرطوب اور ۸۰ فیصد حیوانی گھی رکھنے والی غذا کو کھجور جیسی خشک برائے نام نباتاتی گھی رکھنے والی غذا کے ساتھ ملا کر کھانے سے اعتدال پیدا ہو جاتا ہے اور گرمی سردی والے ہر مزاج کے لوگ اسی طرح اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ مکھن کو کھجور کے ساتھ ملانے سے ملٹی وٹامن غذا ہو جاتی ہے۔ اگر غذاؤں کا بادشاہ کہیے۔ مکھن کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں۔
حیوانی گھی ۸۱ فی صد، معدنی نمکیات ۲ر۵ کے ساتھ، لحمیات ہزار میں ۱، کیلشیم ۲۰ فاسفورس ۱۶ اور معمولی مقدار میں تھایامین کھجور کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں۔
لحمیات ۲ر۹، ریشہ دار سوتف ۷ر۱ معدنی نمکیات ۱ر۱، نشاستہ دار گلوکوز ۳۸ء۶۳ اور نباتاتی گھی ۸ر فی صد۔ اس میں فی دس ہزار کیلشیم ۵۱، فاسفورس ۳ء۱ اور فولاد ۲ر۱ کے ساتھ تھایامین بھی ہوتی ہے۔

سرگوشیاں

سوال و جواب

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، طبی، ادبی سوالوں کے جوابات دیے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق سے گرے ہوئے اور فحش و ہرزہ سوالات شامل نہیں کیے جاتے۔ ہر شخص خواہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو، زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھیے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لیے جگہ چھوڑنا لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا (ایڈیٹر بیسویں صدی)

فخرالدین انصاری ــــ مشرقی سنگھ بھوم

س : کنجوس شخص، فراخ دلی کا مظاہرہ کب کرتا ہے؟

ج : جب فراخ دلی کے مظاہرے سے دولت میں اضافہ متوقع ہو۔

س : خواجہ الطاف حسین حالی کا کوئی شعر سنائیے؟

ج : ؎ ہوتی ہجوم غم میں ہے کیوں زہر کی تلاش
حالی بتائیں آپ کو گر کچھ کھلائیے

منصور علی خاں اکیلا ــــ ظہیر آباد

س : دولت اور طاقت کا غرور کہاں چکنا چور ہوتا ہے؟

ج : موت کے سامنے۔

س : کسی چیز کی قدر کب گھٹتی ہے؟

ج : جب وہ چیز کسی ایسے شخص کے ہاتھ پڑ جائے جو اس کی قدر و قیمت سے واقف نہ ہو۔

س : آج کل کے نوجوان کیا چاہتے ہیں؟

ج : تن آسان زندگی۔

مسعود احمد ــــ نرمل

س : انسان کی عظمت کس بات میں پنہاں ہوتی ہے؟

ج : اس کے کردار اور اس کے عمل میں۔

س : رہبر کی لغزش کا اثر کتنا پڑتا ہے؟

ج : اس کی لغزش سے قومیں نابود ہوسکتی ہیں۔

س : تشدد پر آمادہ کون ہوتے ہیں؟

ج : جو امن اور عدم تشدد میں یقین نہیں رکھتے۔

تصویر احمد نوری ــــ کوٹہ راجستھان

س : جب ساری تدبیریں الٹی ہوجائیں؟

ج : .... تو تقدیر پر یقین کرنا چاہیے۔

س : غربت جب ذلت بن جائے...؟

ج : .... تب بھی تدبیر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے۔

محمد غوث علی خاموش ــــ یلاریڈی

س : زخم بھرنے کے باوجود تکلیف کب ہوتی ہے؟

ج : جب زخم بھر جانے کا احساس تکلیف دہ ہوجائے۔

س : خوشی کے حصول پر بھی کب خوشی حاصل نہیں ہوتی؟

ج : بقول اقبال ؎
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

مہرالنساء بیگم ــــ تلگنڈہ

س : آج کل محبت کے جذبے کو لوگ حقارت کی نظر سے کیوں دیکھتے ہیں؟

ج : کیونکہ ؎
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی

س : کیا اب کی دنیا اچھی ہے یا پہلے کی دنیا اچھی تھی۔؟

ج : دنیا ہمیشہ اچھی تھی، اب بھی اچھی ہے مگر انسانی فکر اسے اچھا یا برا بنا دیتی ہے۔

حافظ دلکش جالونوی ــــ آگرہ

س : محبت کے کتنے روپ ہوتے ہیں؟

ج : بے شمار!

س : عشق حقیقی ہوتا ہے یا مجازی؟

ج : دونوں۔

س : حقیقت کا اظہار کب ہوتا ہے؟

ج : جب اظہارِ حقیقت ضروری ہوجاتا ہے۔

سیّد حسین جرنلسٹ ــــ دیور کنڈہ

س : پھول اور کانٹے میں قربت کے باوجود حسد کیوں نہیں ہوتا؟

ج : دونوں اپنی اپنی فطرت سے واقف ہیں۔

س : امیری غریبی اور اونچ نیچ کب تک؟

ج : جب تک انسان، انسان نہیں بن جاتا۔

ایم۔ شہاب الدّین ــــ دربھنگہ

س : اگر ہنسی مذاق میں کسی سے پیار ہوجائے تو کیا کرنا چاہیے؟

ج : ہنسی مذاق سمجھ کر اسے فراموش کر دینا چاہیے۔

س : اگر خوبصورتی جان کی دشمن بن جائے تو کیا کرنا چاہیے؟

ج : تو اسے خوب سیرت بن جانا چاہیے۔

س : خوبصورت لڑکیاں غیروں پہ کرم اپنوں پہ ستم کیوں کرتی ہیں؟

ج : یہی حسن کی فطرت ہے۔

رئیس ــــ دہلی

س : تفرقے کون پیدا کرتے ہیں؟

ج : رہنما۔

س : امن کون چاہتے ہیں؟

ج : عوام۔

س : صلح کون کرواتے ہیں؟

ج : امن پسند۔

یوسف النساء بیگم ــــ دیور کنڈہ

س : دوست نما دشمن کون ہوتے ہیں؟

ج : منافق اشخاص۔

س : انسان کی تنہائی کا ساتھی کون

ج: بیتی ہوئی یادیں۔ بقول تسنیم جے پوری
اُف یہ شامِ تنہائی سلسلہ خیالوں کا
کیا ہجوم رہتا تھا گھر میں خوش جمالوں کا

جاوید سعید ـــــ امروہہ

س: لڑکیاں اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہیں؟
ج: پری زادیاں۔
س: آج کا ہندوستان کن لوگوں کے کارناموں سے پریشان ہے؟
ج: اپنے رہنماؤں کے کارناموں سے

شبانہ ـــــ سرائے کہنہ

س: لیڈر اور گرگٹ میں فرق کیا ہے؟
ج: کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں ہی رنگ بدلنے میں یکساں فطرت کے حامل ہوتے ہیں۔
س: ماں گوری، باپ کالا تو پھر بچے؟
ج: گندمی

غلام مصطفےٰ اعرشی ـــــ نرمل

س: لیڈر وعدے کرتے وقت یہ کیوں نہیں سوچتے کہ وہ وعدے پورے کرسکیں گے یا نہیں؟
ج: وقتی ضرورت انھیں مستقبل بعید سے بے پروا کردیتی ہے۔
س: کیا ہندوستان کی جمہوریت دم توڑ دے گی یا توڑ دینے والی ہے یا دم توڑ رہی ہے؟
ج: جی نہیں جمہوریت اتنی کمزور شے نہیں۔ جب تک عوام بیدار ہیں، جمہوریت زندہ رہے گی۔

[..]نز فاطمہ ـــــ گوالیار

[س]: عرب ممالک جانے کے لیے کیا محرم کا ساتھ ہونا ضروری ہے؟
[ج]: [ص]رف حج اور عمرہ کی ادائیگی کے [لیے م]کہ اور مدینہ (سعودی عرب) [...] خواتین کے لیے محرم کا ہم سفر [...] ہے۔
نہانا کیوں چھوڑ[...]

دیتے ہیں؟
ج: کیونکہ وہ بیوی کے ہاتھ کا بنا ہوا ہوتا ہے۔

مجتبیٰ فاروق علی انصاری ـــ یلاریڈی

س: شہرت کی بلندیوں تک رسائی کے لیے کیا دولت کا ہونا ضروری ہے؟
ج: جی نہیں۔ شہرت دولت کی محتاج نہیں ہوتی۔

روشن خان ـــــ جبل پور

س: آج کے اس تیزی سے بھاگتے زمانے میں تعلیم زیادہ ضروری ہے یا ہنر؟
ج: ہنر کے ساتھ تعلیم ہو تو سونے پر سہاگہ کا کام دیتی ہے۔
س: اکثر لڑکے شادی ہو جانے کے بعد ماں باپ کے ساتھ نہیں رہتے، ایسا کیوں؟
ج: یہ موجودہ تہذیب کی دین ہے۔
س: صبح کا بھولا شام ہی کو واپس آتا ہے دوپہر یا رات کو نہیں، کیوں؟
ج: کیونکہ صبح کی انتہا شام ہی ہے۔

پروین خالق ـــــ الریاض

س: انسان کی تمناؤں کی حد کیا ہونی چاہیے؟
ج: تمناؤں کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ بقولِ غالب
ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
س: دولت کے باوجود انسان کو نیند کیوں نہیں آتی؟
ج: اس لیے کہ کہیں کوئی اس کی دولت چرا نہ لے۔

اقبال اشہر ـــــ دہلی

س: زندگی کی اداس راہوں میں اگر کہیں خوشی نہ ملے تو کیا کرنا چاہیے؟
ج: تو حالات سے سمجھوتہ کرلینا چاہیے۔
س: اگر کسی لڑکی سے محبت ہو جائے تو اس کا اظہار اس سے کس طرح کرنا چاہیے؟
ج: بقول حسرت موہانی
بے زبانی ترجمانِ شوق بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں
س: مجھے ایسے ہم سفر کی تلاش ہے جو زندگی کے سفر کو سہانا بنا دے۔ بتلائیے کہاں تلاش کروں اسے؟
ج: اپنے قرب وجوار میں، اپنے حلقے میں، اپنے دل میں۔

کلام احمد آرزو ـــــ ہزاری باغ

س: بار بار ماضی کے اوراق الٹ کر کون دیکھتا ہے؟
ج: وہ شخص جو ماضی سے سبق سیکھنا چاہتا ہے۔ بقولِ ظفر احمد نظامی
اپنے ماضی سے کچھ سبق سیکھو کہ آئندہ کام آئے گا
کھنچی جائے گی جتنی پیچھے کماں تیر اتنا ہی دور جائے گا

گلناز ـــــ مراد آباد

س: اقتدار ہاتھ آتے ہی لیڈر وعدے کیوں بھول جاتے ہیں؟
ج: بقول مظفر شاہجہانپوری
اک حرف کے اضافے کو سمجھے وہ انقلاب
عہدہ ملا تو عہد سے اپنے مکر گئے
س: کانگریس ناکامی کی راہ پر گامزن ہے اس کی وجہ؟
ج: اس کے رہنماؤں کی غلط روی اور غلط پالیسیاں۔
س: حالیہ چار ریاستی انتخابات اور چھ ریاستوں میں ہونے والے انتخابات سے کانگریس کو کیا سبق لینا چاہیے؟
ج: یہی کہ اُسے اپنی روش بدلنی چاہیے اور وقت کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی پالیسیوں کو مرتب کرنا چاہیے۔

ظہیر الدین سلمانی ـــــ بمبئی

س: عورت اپنی ہار کب تسلیم کرتی ہے؟
ج: جب اس کی انا پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔

کیا ذوق ہے، کیا شوق ہے، سو مرتبہ دیکھوں
پھر بھی یہ کہوں جلوۂ جاناں نہیں دیکھا
(داغؔ)

Biswin Sadi Monthly Delhi Postal Regd. No. DL-11223/95 R.No.630/57.
Price Rs. 12/- A.H.W. May,1995